

صفا
دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد

جامعہ اسلامیہ دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد کا علمی، دینی، ادبی، سہ ماہی رسالہ

صفا

مدیر اعلیٰ:
محمد رضوان القاسمی

مدیر:
خالد سیف اللہ رحمانی

شمارہ: ۱۸
شوال، ذیقعدہ، ذوالحجہ ۱۴۱۲ھ
مطابق:
اپریل، مئی، جون ۱۹۹۲ء

- سالانہ ۴۰/- روپے
- معاون خصوصی ۱۰۰/- ″
- فی پرچہ ۱۲/- ″

ناشر: شعبہ نشر و اشاعت، دار العلوم سبیل السلام
پوسٹ بالاپور حیدرآباد، ۵۰۰۰۰۵ - انڈیا
فون نمبر ۲۳۹۴۵۰

فہرستِ مضامین

افتتاحیہ	محمد رضوان القاسمی	۳
قرآن وحدیث •		
حضرت تھانویؒ کی تفسیری خدمات	مولانا عبید اللہ اسعدی	۷
ملاقات کے آداب — حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں	مولانا اشرف علی قاسمی ہبلی	۲۱
فقہ اسلامی •		
جمعہ قائم کرنے کی شرطیں اور دیہات میں نمازِ جمعہ کا مسئلہ	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ترجمہ: مولانا سیف اللہ قاسمی	۳۴
فقہی اختلافات کی بنیاد اور ان کا نقطۂ اعتدال	مولانا رضوان احمد ندوی	۴۵
اسلام میں سرمایہ کاری کے اصول	مولانا سید حسنین احمد ندوی	۵۵
نقد و نظر •		
قادیانی فتنہ کا سنجیدہ جائزہ	جناب محمد حبیب الدین صاحب	۶۴
سوال وجواب •		
فقہی مذاکرہ	خالد سیف اللہ رحمانی ترتیب: مولوی شکیل احمد رحمانی	۷۴
دار العلوم سبیل السلام •		
خبر نامہ	مولانا عبد المجید قاسمی	۹۰
واردین و صادرین کی نظر میں	مولانا محمد حنیف ملی	۹۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افتتاحیہ

مقامِ مسرت ہے کہ ۳۰، ۳۱؍ اکتوبر اور یکم، ۲؍ نومبر ۹۲ء کو پانچواں فقہی سمینار جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ میں منعقد ہو رہا ہے، اعظم گڈھ اور اس کے مضافات میں مختلف علومِ اسلامی کی جو عبقری شخصیتیں پیدا ہوئیں، ان سے علمی دنیا کا کون سا شخص ناواقف و نابلد ہوگا۔ اسی شہر کو علامہ شبلی نعمانیؒ کی جائے سکونت ہونے کا شرف حاصل ہے اور یہیں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے دار المصنفین کی صورت میں اپنے استاذ کے خواب کو تعبیر کا پیکر بنایا ہے، اس لئے اس اہم اور تاریخی سمینار کے لئے علم و تحقیق و ادب کی اس تاریخی سرزمین کا انتخاب عین مناسب ہے۔

اسلامی فقہ اکیڈمی نے ہندوستان کے علماء اور اربابِ افتاء میں نئے مسائل پر سوچنے، لکھنے اور اس طرح کے مسائل میں اجتماعی رائے تک پہنچنے، نیز شورائی طریق بحث اختیار کرنے کی جو تحریک پیدا کر دی ہے، وہ نہایت نیک فال اور روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ خصوصیت سے اکیڈمی نے نوجوان علماء میں فقہی مسائل پر غور و تحقیق کا جو ذوق پروان چڑھایا ہے، وہ علم و تحقیق کے کام میں تسلسل کو باقی رکھے گا اور انشاء اللہ علمی خلاء پیدا نہ ہونے دے گا۔ اللہ کرے اکیڈمی اسی نہج پر اپنا سفر جاری رکھے اور تعب و تھکن سے آشنا نہ ہو۔

پانچویں فقہی سمینار میں اسلامی بینک کاری کے علاوہ زکوٰۃ سے متعلق جدید پیش آمدہ مسائل زیرِ بحث ہیں، جو نہایت اہم، بڑے غور و خوض کے طالب اور دور رس اثرات و نتائج کے حامل ہیں، خصوصیت سے زکوٰۃ کی اجتماعی تنظیم نہ صرف مسلمان ملکوں کا منصبی فریضہ ہے، بلکہ ہندوستان اور اس جیسے ملکوں میں بھی وقت کی اہم ترین ضرورت کا درجہ رکھتی ہے، اس کے ذریعہ امت کے بہت سے مسائل حل کئے جاسکتے ہیں،

اور مختلف شعبہائے حیات میں مسلمانوں کو خود مکتفی بنایا جاسکتا ہے۔ خدا کرے یہ سمینار اس سلسلہ میں نہ صرف مسلمانوں کی رہنمائی کرے، بلکہ اس کے لئے ہندوستان کے موجودہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی عملی خاکہ بھی مرتب کرسکے۔ وباللہ التوفیق۔

ہندوستانی مسلمان اس وقت صالح قیادت کی شدید قلت کا شکار ہیں اور ایک ایسے پلیٹ فارم کی ضرورت ہے، جہاں مسلمانوں کی منتشر صلاحیتوں کو جمع کیا جاسکے اور مختلف میدانوں میں اس میدان کے متخصصین اور تجربہ کار لوگوں سے اس طرح کام لیا جائے کہ ان میں ربط و ہم آہنگی بھی قائم رہے، اس کی قیادت ایک طرف امت کے بارسوخ اور عوامی نمائندوں پر مشتمل ہو اور دوسری طرف ذہین و باصلاحیت، سنجیدہ اور وقت شناس افراد کی ایک جماعت بھی ان کے دوش بدوش کام کرے، ان دونوں طبقوں کا امتزاج ہی صالح اجتماعی قیادت کو وجود میں لاسکتا ہے۔

گذشتہ دنوں بمبئی میں بڑی کامیابی کے ساتھ "اتحادِ ملت کانفرنس" منعقد ہوئی، جس میں ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے نمائندے اکٹھے ہوئے، اس کانفرنس میں "ملی کونسل" کی بنیاد رکھی گئی۔ کونسل کا مقصد مختلف دینی دعوتی، تعلیمی، معاشی اور سیاسی شعبوں میں امتِ اسلامیہ ہند کی خدمت کا عظیم الشان منصوبہ پیش کیا ہے، کونسل میں جو لوگ شریک ہیں ان کی صلاحیتوں اور ان کے بارے میں ماضی کے تجربات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انشاء اللہ اس کا وجود ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے لئے بہت خوش آئند ثابت ہوگا —— سب سے زیادہ لائق مسرت بات یہ ہے کہ اس کونسل کے اجلاس میں معروف عالم و محقق حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی نے کانفرنس کی پالیسی اور غرض و غایت کے اظہار میں مثبت لب ولہجہ استعمال کیا ہے اور ان لوگوں کے خلاف جو کہ اس تحریک میں شریک نہیں ہیں کوئی منفی بات نہیں کہی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تحریک کو تقویت عطا فرمائے اور اس کے ذریعہ قوم و ملت کا کام لے۔

یورپ میں جن ملکوں سے کمیونسٹ تحریک کو ہجرت کرنی پڑی ہے، ان میں ایک یوگوسلاویہ بھی ہے۔ یوگوسلاویہ تین اقوام پر مشتمل تھا، سرب نسل کے عیسائی علاقے، کروشین نسل کے عیسائی علاقے، بوسنیا جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، کروشیا کی طرح بوسنیا نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کیا، مگر یہ آزادی سربوں

اور دوسری یورپی قوموں کو کسی طرح گوارہ نہیں اور وہاں ایسے انسانیت سوز بہیمانہ مظالم ڈھائے جارہے ہیں اور مسلمانوں کو ایسی ایذائیں پہنچائی جارہی ہیں جنہیں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ خود مسلم ملکوں نے بھی اس مسئلہ پر مناسب ردعمل اور بوسنیا کی مالی اور دفاعی نیز سیاسی مدد کے بجائے خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ امریکہ اس وقت پوری دنیا میں داروغہ کا کردار ادا کر رہا ہے اور مغربی اقوام اس کی پولس کی حیثیت سے کمزور ملکوں پر کمال بہادری کا سکہ جمارہی ہیں اور خود امریکہ کے سامنے گھٹنے ٹیکے ہوئی ہیں۔ مسلم ممالک اگر متحد ہوتے تو وہ ایک آزادانہ حکمت عملی اختیار کر سکتے تھے، مگر موجودہ حالات میں ان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔

"بوسنیا" کا یہ واقعہ دو حقیقتوں کو واضح کرتا ہے، ایک یہ کہ مغرب کا تہذیب وانسانیت کا نعرہ محض ایک فریب ہے، جو دوسروں کے معاملات میں مداخلت کا جواز پیدا کرنے کے لئے ہے، خود مغربی ممالک جس قدر بھی وحشت وبربریت کا سلوک روا رکھیں اس پر ایک آواز بھی نہیں اٹھتی — دوسرے یہ کہ اسلام اور صلیب کی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، وہ اب بھی جاری ہے، البتہ اس کی شکل بدل دی گئی ہے اور اب وہ مختلف حیلوں اور بہانوں سے لڑی جارہی ہے — کاش مسلمان اور عالم اسلام اس حقیقت کو سمجھ سکیں اور طویل منصوبہ بندی کے ساتھ کام کریں۔

ملّتِ اسلامیہ ہند، اس وقت بڑے نازک دور سے گذر رہی ہے، ہندوستان کی خارجہ پالیسی یکسر بدل چکی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بی، جے، پی نے اس پالیسی کی تشکیل کی ہو، اندرونِ ملک بھی بڑے بڑے فتنے سر اٹھا رہے ہیں، متعدد ریاستوں میں بی، جے، پی حکومتیں ہیں، ان ریاستوں میں نصابِ تعلیم کا مکمل طور پر "ہندو کرن" کر لیا گیا ہے، مرکزی حکومت ایک بے جان بت کی طرح یہ تمام تماشے دیکھ رہی ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لئے "اتحاد" سب سے بڑی ضرورت ہے، مسلم دشمن طاقتیں پوری قوت کے ساتھ کوشاں ہیں کہ مسلمانوں میں اختلاف کے بیج بوئیں اور ان کی طاقت کو توڑ کر رکھ دیں۔

اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ قوم کے معتمد اور ذہین وبے لوث قائدین کی زندگی کو مجروح کیا جائے، عام لوگوں کو ان سے برگشتہ کیا جائے اور بے اعتمادی کی فضا پیدا کی جائے۔ جب

مخلص رہنما اعتماد و اعتبار سے محروم ہو جاتے ہیں تو دوسرے درجہ کے لوگوں کو ابھارا جاتا ہے اور ان سے ملّت کے مفاد کے خلاف غیر محسوس طور پر وہ کام کرائے جاتے ہیں جو پہلے ممکن نہ تھے، روس نے جب اسلامی علاقوں پر قبضہ کیا تو ابتداء میں یہی طریقہ اختیار کیا۔

افسوس کہ اس وقت ہندوستان میں مخلص مسلمان رہنماؤں کے متعلق کردار کشی کا یہی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے اور بظاہر یہ سب خود مسلمانوں کے قلم سے کرایا جا رہا ہے، اور اظہارِ حقیقت اور اظہار حق کے نام پر کرایا جا رہا ہے، جن مسائل کو نجی طور پر اور زبانی گفتگو کے ذریعہ حل کیا جا سکتا تھا ان کو صحافت کے میدان میں لاکر اہانت و تذلیل کی سعی کی جا رہی ہے، اور جو لوگ اس کردار کشی کی مہم میں شریک ہیں، ان کی نگاہوں سے ان رہبروں کے محاسن، ان کی خوبیاں اور ان کی صلاحیتیں بالکل اوجھل ہو جاتی ہیں، اور اس شعر کا مصداق ہیں کہ ؎

فرق آنکھوں میں نہیں، فرق ہے بینائی میں ؎ عیب بیں عیب، ہنرمند ہنر دیکھتے ہیں

حالانکہ جو لوگ اس موضوع پر قلم اٹھا رہے ہیں، ان کی اپنی ذاتی زندگی پر قلم اٹھایا جائے تو اس سے بہت زیادہ لکھنے کی گنجائش موجود ہے۔ اپنے ذاتی اور وقتی مفادات کے سامنے امت کے وسیع تر، اجتماعی مفادات کو نظر انداز کر دینا اور اختلاف و انتشار کا باعث بننا سب سے بڑا گناہ ہے، صد افسوس کہ کچھ لوگوں نے مستقل طور پر اس لباس کو اپنے قامتِ زیبا پر چست کر لیا ہے، وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ ؎ میری رسوائی پہ تم کو خوش نہ ہونا چاہیے ؎ قیس رسوا تھا تو کیا لیلیٰ کی رسوائی نہ تھی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر امت کو انتشار و افتراق سے بچانے کے لئے غلطیوں پر سکوت کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ امام المسلمین اچھا ہو یا برا، اس کے پیچھے نماز ادا کی جائے، یہ بھی فرمایا کہ ہر امیر کے زیر نگیں جہاد کرو۔ ان ہدایات کا منشا یہی ہے کہ مسلمانوں کی طاقت میں شگاف پڑنے نہ پائے۔

اب یہ امت کا فریضہ ہے کہ وہ اس طرح کے فتنوں سے چوکنا رہے، اپنے مخلص رہبروں اور جذباتی نعروں سے لیس بے شعور قائدین کے درمیان امتیاز کرے، خیر کے ہر کام میں تعاون کرے اور ان لوگوں سے دور رہے جن کو لڑنے جھگڑنے میں مزہ آتا ہے۔

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

حضرت تھانویؒ کی تفسیری خدمات

مولانا عبید اللہ اسعدی
استاذِ حدیث جامعہ عربیہ ہتھورا ــــ باندہ

واقعہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو علوم وفنون میں جامعیت کی ایک خاص شان عطا فرمائی تھی۔ آپ علومِ متداولہ، علومِ آلیہ اور علومِ عالیہ سب میں کمال مہارت، بلکہ اجتہادی مقام کی معلومات وبصیرت پر فائز تھے، جیساکہ آپ کی تالیفات وافادات ناطق ہیں اور ربطور تحدیث نعمت تصریحات وارشادات بھی شاہد ہیں۔ اور یہ امتیاز اور تفوق وتخصص ایک ہی علم میں نہیں، بلکہ دین کے تین اہم علوم میں حاصل تھا، جن میں سے ایک علم "تفسیر" ہے۔

علومِ دینیہ میں علم تفسیر کا مقام واہمیت

علوم دینیہ میں تفسیر کا کیا مقام ہے اور اس سے واقفیت اور بالخصوص اس میں کمال کے لئے کیا چیزیں درکار ہیں اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ اسلام کا اصل ومکمل دستور اور اسلامی احکام کا اصل منبع وسرچشمہ قرآن کریم ہی ہے، اس اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ اس کے الفاظ بھی حق تعالیٰ کے نازل کردہ ہیں اور تفسیر کا حاصل قرآن کریم کے الفاظ کے معانی ومطالب سے اپنی وسعت کی بقدر واقف ہونا اور ان کا بیان کرنا ہے۔

اور چونکہ قرآن کریم زبان وبیان دونوں کے اعتبار سے بے شمار خوبیوں کا حامل ہے اس لئے اس کے سمجھنے کے لئے سرسری طور پر عربی زبان کا جاننا کافی نہیں، بلکہ تمام علومِ عربیت میں بھی کمال کی ضرورت ہے اور منشاء خداوندی کے مطابق معانی ومطالب کو سمجھنے کے لئے مختلف علومِ دینیہ میں درک وبصیرت کی ضرورت ہوتی ہے اور ان سب کے ساتھ اس کے مناسب وشایانِ شان "ملکہ" مستقل اور اہم شرط ہے ــــ اسی اہمیت

کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صحابہ رضی اللہ عنہ نے تفسیر قرآن کے معاملہ میں احتیاطِ خاص کی تاکید فرمائی ہے۔

تفسیر سے مناسبت

حضرت تھانویؒ نے بھی بطور تحدیثِ نعمت اس کا اظہار و اعتراف فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت کو جن علوم دینیہ سے خصوصی مناسبت عطا فرمائی تھی ان میں نمایاں و امتیازی دو علوم ہیں۔ تفسیر و تصوف۔ اگرچہ علوم فقہ میں حضرت کا مقام و خدمات بھی امتیازی درجہ کی ہیں جیسا کہ حدیث و کلام سے خصوصی مناسبت بھی مخفی نہیں ہے۔ مگر خود حضرت والا نے جن علوم میں امتیاز اور خصوصی مناسبت کا اظہار کیا ہے وہ تفسیر و تصوف ہیں۔

کسی فن سے خصوصی مناسبت کا مصداق دراصل ان سے متعلق وہ ملکہ کہلاتا ہے جس کی بنا پر انسان اس علم و فن میں مجددانہ و مجتہدانہ شان کے حامل کارہائے نمایاں انجام دیا کرتا ہے۔ اور تصوف وغیرہ کی طرح علم تفسیر میں بھی آپ کو بلاشبہ یہ ملکہ حاصل تھا، جس کا سب سے واضح اور بیّن ثبوت اور شاہد یہ امر ہے کہ آپ نے مشکل سے مشکل مقامات میں ایسی محتاط، صاف و بے داغ اور دل کو لگتی توجیہات فرمائی ہیں کہ بے اختیار زبان سے تحسین نکلتی ہے۔ اور ایسے ایسے اشکالات کو محض چند لفظوں اور جملوں میں حل فرمایا ہے کہ جو بعض اوقات دسیوں کتب اور ہزارہا اوراق کے مطالعہ سے بھی حل نہیں ہوتے اور نہیں ہوئے جیسا کہ خود آپ نے خطبہ میں اس کی تصریح کی ہے اور جو علامہ انور شاہ کشمیریؒ جیسے وسیع النظر اور متبحر عالم کے بیان القرآن سے متعلق تاثرات سے ظاہر ہے۔ جیسا کہ آگے تفصیل سے آرہا ہے۔

پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ کتابوں میں مذکور معلومات پر نظر کر کے کسی ایک رائے کو ترجیح دینے پر اکتفا کیا ہو، بلکہ بے شمار بہت سی چیزیں محض وہبی طور پر اس ملکہ کی بنیاد پر تحریر فرمائی ہیں! اور از روئے دیانت و تقویٰ ایسے موقع پر اس کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ آپ کے پاس تفسیر کا وہ وافر ذخیرہ نہیں تھا جو آج مہیا و دستیاب ہے۔ اور جو ذخیرہ مہیا تھا وہ درپیش بہت سے اشکالات کے جوابات سے خالی تھا۔ اس لئے آپ نے

اپنی تفسیر میں سلف کی کمال اتباع کے اہتمام کے باوجود اس ملکہ سے کام لیا، اور نہ جانے کتنے دلوں اور ذہنوں کو ان کی علمی الجھنوں سے نکال کر طمانینت اور بصیرت سے سرفراز فرمایا۔

خصوصی مناسبت کا راز و باعث

یوں تو علم دین کا حصول ہی فضل خداوندی ہے ــــــــــــــ مگر اس دنیا میں عموماً ظاہری اسباب کی ضرورت ہوتی ہے اور واقعات و حالات کا رشتہ و تعلق اسباب ہی سے جوڑا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ کو تفسیر سے جو خصوصی مناسبت تھی، ظاہری اسباب کی نسبت دو امر خصوصیت سے اس کا باعث بنے اور ان دونوں کا تذکرہ خود حضرت تھانویؒ ہی نے فرمایا ہے:

ایک تو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی آپ کے حق میں اس کے لئے دعا، و پیشنگوئی ــــــ حاجی صاحبؒ نے تفسیر و تصوف سے خصوصی مناسبت کی آپ کے لئے دعا کی تھی، اور پیشنگوئی بھی فرمائی تھی۔ حتیٰ کہ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں چوک گیا، ورنہ دیگر شعبۂ دینیہ خصوصاً حدیث و فقہ کی مناسبت خاصہ کے لئے بھی حضرت حاجی صاحبؒ سے دعا، کرا لیتا۔[1]

دوسرا امر خواب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی زیارت ہے۔ یعنی روحانی طور پر اس باب میں ان سے کسب فیض ہے۔ حضرت نے ہی ایک سلسلۂ کلام میں ارشاد فرمایا کہ کانپور کے قیام کے زمانہ میں کلام پاک کے ترجمہ و تفسیر کے سنانے کا سلسلہ شروع کیا تو شروع شروع مجھ کو اس سلسلہ سے کچھ خاص مناسبت نہ تھی۔ ایک دن خواب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، میں نے اس زیارت کو اس کی طرف اشارہ سمجھا، چنانچہ اس کے بعد تفسیر سے مناسبت کھلتی اور بڑھتی چلی گئی، حتیٰ کہ حق تعالیٰ نے آپ کو اس فنِ شریف میں وہ مقام عطا فرمایا کہ بعد کے اکابر مفسرین بھی آپ کے تفسیری افادات سے

---

(۱) اشرف السوانح۔ ج ۱، ص ۱۹

استفادہ اور استفاضہ سے مستغنی نہیں رہ سکے اور نہ رہیں گے۔

حضرت کی تفسیری و قرآنی خدمات

یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ مختلف علوم و فنون میں آپ کی تالیفی خدمات ہیں اور ہر فن و باب سے متعلق متعدد کتابیں ہیں۔ قرآن کریم و تفسیر سے متعلق یوں تو آپ کی مایۂ نازو اہم خدمات دو ہیں۔ اولاً و اصلاً مکمل "بیان القرآن" جس کا تفصیلی ذکر آگے آرہا ہے، اور ثانیاً "احکام القرآن" کے افادات۔

لیکن ان دو کے علاوہ اور بھی متعدد چیزیں ہیں اور موضوع و محتویات کے اعتبار سے اپنی جگہ پر اہم اور گرانقدر ہیں۔ یہ تالیفات دو طرح کی ہیں، ایک تو تجوید و قرأت سے متعلق، دوسرے قرآن کریم کی تفسیر و بیانِ مطالب سے متعلق۔

تالیفات بابت تجوید و قرأت

تجوید قرأت سے متعلق بھی اردو اور عربی میں حضرت کی کل آٹھ تالیفات ہیں:

۱۔ تجوید القرآن: اس میں مسائل تجوید کو منظوم پیش کیا گیا ہے۔

۲۔ جمال القرآن: اس میں تجوید کے عام مسائل نثر میں مذکور ہیں۔

۳۔ تنشیط الطبع فی اقراء السبع: اس میں قرأت سبعہ اور ان کے رواۃ وغیرہ کا بیان ہے۔ یہ تینوں کتابیں اردو میں ہیں اور تجوید کی تعلیم و تعلم میں بالخصوص دوسری و تیسری رائج و متداول ہیں۔

۴۔ رفع الخلاف فی حکم الاوقاف: اوقاف قرآنیہ کے بارے میں قرار کے درمیان جو اختلاف ہے اس کی توجیہہ و تطبیق اس میں کی گئی ہے۔

۵ و ۶۔ آداب القرآن و یادگار حق القرآن: دونوں قرآن کریم کی تلاوت کے آداب و مسائل سے متعلق ہیں۔

۷۔ وجوہ المثانی مع توجیہ الکلمات والمعانی: اس میں مشہور قرأتوں کے اختلافات کو

سورتوں کی ترتیب کے مطابق جمع کیا گیا ہے۔ آخر میں تجوید و قرأت کے قواعد بھی مذکور ہیں۔ یہ بیان القرآن کی نظر ثانی کے بعد کی اشاعت میں اس کے ساتھ ملا کر ہر جلد کا حصہ اسی کے ساتھ آخیر میں ملحق کر کے شائع ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ ابتداءً مستقل صورت میں بھی شائع ہوا ہے۔

۸۔ زیادات علی کتب الروایات: اس میں غیر مشہور روایات کی سندیں ہیں۔ یہ رسالہ "وجوہ المثانی" کے ساتھ شائع ہوا ہے اور یہ دونوں رسالے عربی میں ہیں۔

تفسیر سے متعلق تالیفات و افادات

اور تفسیر و تشریح قرآن سے متعلق تالیفات حسب ذیل ہیں:

۹۔ سبق الغایات فی نسق الآیات: اس میں پورے قرآن مجید کی آیات کے باہمی ربط کو بیان کیا گیا ہے۔ مختصر مگر نہایت گرانقدر و وقیع چیز ہے۔ اس پہلو پر بہت کم توجہ ہوئی ہے۔ اصل تفسیر "بیان القرآن" میں حضرت نے اس کے مضامین کو اردو میں "ربط" کے عنوان کے تحت ہر ہر ٹکڑے کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور خود یہ رسالہ عربی میں ہے۔

۱۰۔ تصویر المقطعات لتیسیر بعض العبارات: نصاب میں شامل تفسیر کی معروف کتاب بیضاوی کے شروع میں حروف مقطعات سے متعلق جو ایک عجیب و غریب بحث آئی ہے اس رسالہ کے اندر سلیس عربی میں اس کو آسان کر کے بیان کیا گیا ہے۔

۱۱۔ ظہور القرآن من صدور البیان: یہ چند حکایات کا ایک مختصر مجموعہ ہے جس سے قرآن مجید کے وجوہ اعجاز میں سے ایک خاص وجہ کا اثبات مقصود ہے اور وہ یہ کہ قرآن کریم کے لفظ کا اتنا آسان ہونا کہ نہایت کم عمر بچے جو کہ حافظ ہونے کے قابل نہیں ہوا کرتے وہ بھی اس کے حافظ ہوتے ہیں۔ آپ نے اس میں اپنے وقت کے ایسے چند بچوں کے واقعات درج فرمائے ہیں۔

۱۲۔ تقریر بعض البنات فی تفسیر بعض الآیات : حضرت نے خاندان کی بعض بچیوں کو کلام پاک کا ترجمہ پڑھایا تھا تو ان بچیوں نے حضرت کی تقریر کو جمع کیا تھا، جو اکثر آیات سے متعلق ہیں۔

۱۳۔ رفع البناء فی نفع السماء : اس رسالہ میں آیت "الذی جعل لکم الارض فراشا والسماء بناء" کی تفسیر کرتے ہوئے آسمان کے منافع ذکر کئے گئے ہیں۔ عام مفسرین نے زمین کے منافع تو بہت سے گنائے ہیں، مگر اس پر روشنی کم ہی ڈالی ہے۔ یہ "بیان القرآن" کی جلد اوّل کے ساتھ ملحق ہے۔

۱۴۔ احسن الاثاث فی النظر الثانی فی تفسیر المقامات الثلاث : یہ سورۂ بقرہ کی تین آیات کی تفسیر پر نظر ثانی کے بعد تحریر کردہ مضمون ہے۔

۱۵۔ تمہید العرش فی تحدید الفرش : اس میں "استواء علی العرش" کے معنیٰ اور تفسیر و تفصیل مذکور ہے۔ نیز معترضین کے اعتراضات اور جوابات بھی نہایت بسط کے ساتھ آگئے ہیں۔ اہلِ علم ہی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

۱۶۔ القاء السکینۃ فی تحقیق ابداء الزینۃ : اس رسالہ میں آیت "لا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا" کی صحیح تفسیر و تحقیق فرمائی گئی ہے اور ان لوگوں کا جواب دیا گیا ہے جو کہتے ہیں کہ چہرہ اور ہتھیلیوں کا ڈھانکنا و چھپانا واجب نہیں۔

۱۷۔ احسن التفہیم لمقولۃ سیّدنا ابراھیم : سورہ انعام میں اثباتِ توحید سے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو تقریر نقل کی گئی ہے، اس کی توجیہ و تفسیر ہے۔

تفسیر کے سلسلہ کی ہی بعض وہ تالیفات بھی ہیں، جو دراصل بعض ایسے کاموں سے متعلق بطور تنقید تحریر کی گئی ہیں۔

۱۸۔ التقصیر فی التفسیر : بعض مصری تفاسیر کے اندراجات پر تنقید و تنبیہ کی گئی ہے۔

۱۹۔ الہادی للحیران فی وادی تفصیل البیان : "تفصیل البیان فی مقاصد القرآن" نامی ایک کتاب کے نقائص کے بیان پر مشتمل ہے۔

۲۰۔ اصلاح ترجمہ دھلویہ : ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے ترجمہ کی غلطیوں پر تنبیہ، ان کے ترجمہ میں بکثرت ایسی اغلاط ہیں جن سے مسائل شرعیہ اور عقائد اسلامیہ کے سمجھنے میں دھوکہ ہوتا ہے۔

۲۱۔ اصلاح ترجمہ حیرت : مرزا حیرت دہلوی نے ڈپٹی صاحب کے ترجمہ کو پسند نہ کر کے جو ترجمہ کیا خود اس میں غلطیاں کیں، اس میں انہیں غلطیوں کو واضح کیا گیا ہے جیسے کہ سر سید احمد کے معتقدات باطلہ کا ایک چارٹ بھی آپ نے تیار کیا تھا۔ اسی طرح بعض تفاسیر سے متعلق تاثر و تبصرہ مولانا دریا آبادی کی کتاب "حکیم الامت ـ نقوش و تأثرات" میں درج حضرت کے متعدد مکاتیب میں موجود ہے۔ مثلاً تفسیر مولانا فراہی، تفسیر غایت البرہان مولوی محمد حسن امروہوی۔

۲۲۔ مسائل السلوك من كلام ملك الملوك : اس کتاب میں تصوف سے متعلق بدگمانی و برگشتگی کو دیکھتے ہوئے تصوف و سلوک کے مسائل کو آیاتِ قرآنیہ سے ثابت کیا گیا ہے اور تصوف کے ہر شعبہ کی کتاب اللہ سے تائید نقل کی گئی ہے۔ یہ کتاب مخالفین تصوف کے لئے اتمامِ حجت اور محبین و مؤیدین کے لئے امر و باد محبت ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔

۲۳۔ رفع الشكوك من مسائل السلوك : یہ مسائل السلوک کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں اب "بیان القرآن" کے متداول نسخے کے ساتھ حاشیہ پر شائع ہو رہی ہیں۔ نظر ثانی کے بعد سے اس کو حاشیہ پر کر دیا گیا ہے۔ عربی متن اوپر اور اردو نیچے ہے۔

دو کتابیں حضرت کی مزید قرآنی خدمات سے متعلق ہیں :

۲۴۔ اعمال قرآنی ۔ ۲۵۔ خواصِ قرآنی : ان دونوں میں آیاتِ قرآنیہ کے خواص درج ہیں کہ جن کی بنیاد پر انسان اپنی دنیوی مشکلات کے دفعیہ میں ان آیات کا سہارا لے سکتا ہے۔ یہ الٹے سیدھے تعویذ گنڈوں سے حفاظت کا ایک ذریعہ بھی ہے۔

۲۶۔ التبیان: یہ حضرت کے تفسیری افادات کا مجموعہ ہے، جسے مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے مرتب کیا تھا۔ امداد الفتاویٰ کی جلد پنجم میں تفسیر سے متعلق جو ۵۵ صفحات ہیں وہ اور دیگر تالیفات و مواعظ میں حسب موقع جو چیزیں آگئی ہیں وہ مزید برآں ہیں، کانپور کے زمانۂ قیام میں تفسیری خدمات کا ایک سلسلہ یہ بھی رہا کہ آپ عوام کے لئے مسجد میں درس دیا کرتے تھے اور کانپور و تھانہ بھون دونوں جگہوں میں طلبہ کو تو مستفید کرتے ہی رہے۔ تفسیر کی کتابیں پڑھا کر بھی اور براہِ راست قرآن کا ترجمہ و تفسیر پڑھا کر بھی۔

جن تالیفی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے، بعض مستقلاً شائع نہیں ہو سکیں اور بعض مستقلاً اب تک شائع ہو رہی ہیں۔ جیسے کہ تفسیر سے متعلق اکثر رسائل "بوادر النوادر" "امداد الفتاوی" اور "بیان القرآن" میں شامل ہیں۔ بعض حضرات نے بعض رسائل سے متعلق تسہیل وغیرہ کا بھی کام کیا ہے —— یہ خدمات فی الحال احقر کے علم میں آسکی ہیں۔ بعض چیزیں اور بھی ہو سکتی ہیں، جو میرے علم میں نہیں آسکی ہیں۔

حضرت کی تفسیری خدمات اور تفسیر ماجدی

بے جا نہ ہوگا اگر حضرت کے تفسیری مآثر و خدمات میں مولانا دریا آبادی کی تفسیر کو شامل کر لیا جائے۔ بیشک تالیف ان کی، معلومات بھی ان کی، جس سے اس کو امتیاز حاصل ہے۔ مگر "حکیم الامت نقوش و تاثرات" پڑھیے کہ مولانا دریا آبادی کے دل میں اس کی بات کہاں سے جمی اور پھر پُر زور تشجیع کس نے کی۔ قدم قدم پر ہدایات زبانی و قلمی کس نے دیں اور کس کے افادات نے کام کے اندر روح پیدا کی اور کس کے تفسیری کام نے سب سے زیادہ یاوری کی۔ "حکیم الامت" پڑھیے، ورنہ اردو کی تفسیر ہی دیکھیے، کہاں کہاں حضرت تھانویؒ کا نام اور کام اس میں نہیں ہے، اس لئے مولانا دریا آبادی کی تفسیر کو بھی حضرت کی تفسیری خدمات کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ متعلقات میں سے تو ہے ہی۔ انگریزی تفسیر تو حضرت تھانویؒ کی حیات ہی میں مکمل ہو گئی تھی، اردو چلتی رہی۔

بیان القرآن کی تالیف کا داعی وباعث

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی تحریک اصلاح میں جو ایک سلسلہ عوام و خواص کو قرآن کریم کی طرف کما حقہٗ، توجہ دلانے کا شروع کیا تھا، اس نے حضرت امام کے عہد سے ہی اثر دکھانا شروع کر دیا تھا جو کہ برابر بڑھتا ہی رہا۔ اس کا نتیجہ خواص میں مدارس کے نصاب میں اہتمام کے ساتھ ترجمۂ کلام پاک اور متعدد کتب تفاسیر کا شمول ہے اور عوام میں پورے ملک کے طول و عرض کے مختلف علاقوں کی مساجد میں درس قرآن و تفسیر کا زبانی سلسلہ اسی عام توجہ کا اثر یہ تھا کہ طبائع تحریری صورت میں قرآن کریم کے سلیس و مفید ترجمے اور تفاسیر کی طالب تھیں اور اس کا احساس کر کے لوگ خامہ فرسائی کر کے بزعم خود اس ضرورت کو پورا بھی کر رہے تھے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس صدی کے آغاز میں اس انداز کے جو بعض کام سامنے آئے تھے وہ کام مفید ہونے سے زیادہ مضر ثابت ہو رہے تھے۔ اس لئے حالات کے مطابق اس کام کو کرتے رہنے کی ضرورت برابر باقی رہی ہے۔ یہی ضرورت وعام طلب، اور موجود و متداول چیزوں کی مضرت حضرت کے لئے اس گرانقدر کام کے لئے محرک بنی۔ حضرت نے خود "بیان القرآن" کے مقدمہ میں فرمایا ہے:

"بہت روز سے خود بھی اور احباب کے اصرار کی وجہ سے بھی گاہ گاہ خیال ہوا کرتا تھا کہ کوئی مختصر تفسیر قرآن مجید کی لکھی جائے جو ضروریات کو حاوی اور زوائد سے خالی ہو، مگر تفاسیر و تراجم کی کثرت کو دیکھ کر اس امر کو زائد سمجھا جاتا تھا۔ اسی اثناء میں نئی حالت یہ پیش آئی، کہ بعض لوگوں نے محض تجارت کی غرض سے نہایت بے احتیاطی سے قرآن کے ترجمے شائع کرنے شروع کئے، جن میں بکثرت مضامین قواعد شرعیہ کے خلاف ہیں، جن سے عام مسلمانوں کو بہت مضرت پہنچی۔ ہر چند کہ چھوٹے چھوٹے رسالوں سے ان کے مفاسد پر اطلاع دے کر ان مضرتوں کی روک تھام کی کوشش کی گئی۔ مگر چونکہ کثرت سے ترجمہ بینی کا مذاق پھیل گیا ہے وہ رسالے اس غرض کی تکمیل کے لئے کافی ثابت نہ ہوئے، تاوقتیکہ ابنائے زمانہ کو کوئی ترجمہ بھی نہ بتلایا جاوے، جس میں مشغول ہو کر ان تراجم مبتدعہ مخترعہ سے بے التفات ہو جائیں۔ ہر چند کہ تراجم و

تفاسیر محققین سابقین کے بالخصوص خاندان عزیزیہ کے ہر طرح کافی ووافی ہیں۔ مگر ناظرین کی حالت وطبیعت کو کیا کیا جائے کہ بعض تفاسیر میں عربی یا فارسی نہ جاننے کی مجبوری، بعض تراجم میں اختصار یا زبان بدل جانے کا عذر مانع دلچسپی ہوا۔ تامل ومشورہ سے یہی ضرورت ثابت ہوئی کہ ان لوگوں کو کوئی نیا ترجمہ دیا جائے، جس کی زبان وطرز بیان وتقریر مضامین میں ان کے مذاق وضرورت کا حتی الامکان پورا لحاظ رہے اور ساتھ ہی اس کے کوئی ضروری مضمون خواہ جزء قرآن ہو یا اس کے ساتھ متعلق ہو رہ نہ جائے۔"

بہرحال حضرت کے ان الفاظ سے ہم نے جو کہا ہے وہ ظاہر ہے کہ اس کی ایک عام ضرورت و طلب بھی محرک تھی، ساتھ ہی جو کچھ موجود تھا اس کی مضرت بھی مقتضی تھی اور حضرت کا جو فیض عام جاری ہو چکا تھا اور اپنے حلقہ میں اعتماد واستناد حاصل تھا اس کی وجہ سے متعلقین کا تقاضا واصرار اس تحریک کو مزید تقویت پہنچا رہا تھا۔

خاندانِ ولی اللٰہی کی قرآنی خدمات

حضرت کے بیان میں جو خاندان عزیزیہ کا تذکرہ آیا ہے تو خاندانِ عزیزیہ سے دراصل ولی اللٰہی خاندان اور امام دہلوی کے اخلاف خلف اکبر شاہ عبدالعزیز دہلوی (۱۲۳۹ھ) اور ان کے برادران خورد مراد ہیں کہ حق تعالیٰ نے اس پورے گھرانہ سے جس پیمانہ پر علم و دین کی خدمت کا کام لیا اظہر من الشمس ہے اور اس خاندان کی ایک نمایاں اور عمومی افادہ کی خدمت جس کا براہِ راست افادہ اب تک جاری ہے وہ قرآن کریم سے متعلق ان کی خدمات ہیں، ایک تو خود امام دہلوی کا ترجمہ ومختصر تفسیر جو دراصل ان حضرات کی خدمات کی بنا وبنیاد ہیں۔ پھر ان کے صاحبزادگان عالی شان میں سے تین کے تراجم وتفاسیر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی تفسیر عزیزی جس کے متعلق علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے فرمایا ہے کہ یہ مکمل ہوتی تو امت کے سر سے تفسیر قرآن کا فرض اتر جاتا۔(۱) شاہ عبدالقادرؒ (م ۱۲۳۰ھ) کا ترجمہ وحواشی بالخصوص ترجمہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اردو میں

---

(۱) مشکلات القرآن، ص ۴۔

پہلا با محاورہ و مستند ترجمہ ہے، جو چالیس سال کے عرصہ میں تیار ہوا، مولانا یعقوب صاحبؒ نے اس کو الہامی قرار دیا ہے[1]۔ اور مولانا نانوتویؒ نے اس کے متعلق فرمایا کہ اگر قرآن پاک اردو میں نازل ہوتا تو ایسا ہی ہوتا، یا قریب قریب[2] ——— اسی لئے یہ ترجمہ بعد کو بنا ترجمہ قرار پایا، شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا ترجمہ جو کہ لفظی سمجھا جاتا ہے اور بقول دریا آبادی اس اعتبار سے دوسرے ترجموں سے مستغنی کرنے والا ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کی "تفسیر مظہری" (عربی، جس کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے) وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ کہ قاضی صاحبؒ امام دہلوی کے اخص تلامذہ میں سے تھے۔

تالیف کا آغاز و اتمام

جیسا کہ تفصیل سے ذکر کیا گیا کہ حالات نے آپ کو اس کام کی شدید ضرورت کا احساس دلایا اور ایک اہم علمی دینی ضرورت محسوس کر کے اس کام کو شروع کر دیا اور حق تعالیٰ نے چند سال کے عرصہ میں جب کہ آپ چالیس سال کے آس پاس تھے اس کو تکمیل کے مرحلہ تک پہنچا دیا اور آپ کی حیات ہی میں اس کی اشاعت بھی ہوئی، مقبولیت دیکھی اور اللہ تعالیٰ نے عمر میں اتنی برکت دی کہ ایک طویل عرصہ کے بعد حضرت نے نظر ثانی فرما کر گویا اس کو ایک نئی تفسیر بنا دیا۔ خود فرماتے ہیں:

"چند روز تک یہ رائے تجویز اور پیرایۂ تذکرہ میں رہی۔ آخر جب احباب کا تقاضا زیادہ ہوا، اور خود بھی اس کی ضرورت روزانہ مشاہدہ میں آنے لگی۔ آخر بنامِ خدا محض توکلاً علی اللہ، پھر اس اطمینان پر کہ اگر میں کسی قابل نہیں ہوں تو کیا ہوا بزرگانِ عصر اصلاح فرما کر اس کو دیکھنے کے قابل کر دیں گے۔ آخر ربیع الاول ۱۳۲۰ھ میں اس کام کو شروع کرتا ہوں اور اللہ تعالےٰ سے امید تمام اور نفع انام رکھتا ہوں۔

---

(۱) مقدمہ معارف القرآن۔ ص، ۸، ۶۔

(۲) تعارف حواشی شبیریہ۔

حضرت کی تصریحات کے مطابق آپ نے اس کام کا آغاز ربیع الاول ۱۳۲۰ھ میں کیا۔ اور یہ مبارک سلسلہ ۱۳۲۵ھ کے آخر میں انتہا کو پہنچا۔ بظاہر اس میں پانچ سال لگے، مگر اصلاً کل ڈھائی سال لگے۔ اس لئے کہ ۱۳۲۰ھ میں کام شروع ہو کر صرف ربع پارہ تک ہو سکا تھا کہ بند ہو گیا، اس کے بعد وسط محرم ۱۳۲۳ھ سے دوبارہ اس کو ہاتھ لگایا اور بالآخر نصرتِ خداوندی کے طفیل میں صرف ڈھائی سال کے قلیل عرصہ میں ایسا مہتم بالشان کام انجام پایا۔ اس کے بعد اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔ اشاعت کے بعد خود سے، نیز دوسرے حضرات کی گذارشات کی بنا پر جو امور و مواقع لائقِ توجہ اور ترمیم و اصلاح کے مناسب ہوئے، ان کے لئے حضرت نے تقریباً بیس سال کے عرصہ پھر ۱۳۵۳ھ میں اپنے آپ کو فارغ فرما کر پوری تفسیر پر نظر ثانی کی اور حسب موقع ترمیم و اضافہ کے ذریعہ اس کو ایک نیا لباس عطا کر دیا اور بقول حضرت کے بعض رسائل وغیرہ کے ملا لینے کی وجہ سے اب جو تفسیر ہمارے سامنے ہے وہ "مکمل بیان القرآن" ہے۔

بیان القرآن کی اشاعت

حضرت کے متعلق تو یہ بات معروف ہے کہ آپ کے علمی افادات کے سلسلہ کو جو عموم حاصل رہا وہ عموم آج کے اس دور میں بھی نایاب ہے، کہ حضرت کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی تحریر اور معمولی سے معمولی تلفظ بھی ضائع نہیں ہوا۔ قدر کرنے والوں نے قید قرطاس کر کے ہر چیز کو دوام بخش دیا۔ حضرت کو خود اہتمام تھا اور خدام بھی میسر تھے کہ وہ ہر چیز کی اشاعت کا اولین فرصت میں انتظام کر دیتے اور پھر "بیان القرآن" کی جو ضرورت و اہمیت تھی اس کے پیش نظر اس میں کیوں تاخیر ہوتی۔ کام پورا ہوا اور کتاب اشاعت کے مرحلہ میں پہنچ گئی۔ سہولت کی خاطر اس کو ڈیڑھ ڈیڑھ سو اور پونے دو سو صفحات پر مشتمل بارہ اجزاء میں کر کے اس کو شائع کرنے کا اہتمام کیا گیا، اور جیسا کہ گذر چکا ہے کہ حضرت کی حیات میں اس کے دو مختلف ایڈیشن شائع ہوئے۔ ایک اولین دوسرا نظر ثانی کے بعد۔

پہلا ایڈیشن ۱۳۲۵ھ میں کتاب کی تکمیل کے بعد ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوا۔ اس وقت تک

مولوی شبیر صاحب کا مطبع اشرف المطابع قائم نہیں ہوا تھا، اس لئے یہ ایڈیشن دہلی کے مشہور مطبع مجتبائی سے اس کے مالک شیخ عبدالاحد صاحب کی نگرانی میں منظر عام پر آیا۔ نظر ثانی کے بعد جو ایڈیشن شائع ہوا وہ تھانہ بھون کے اشرف المطابع سے شائع ہوا، بلکہ مطبع کے مالک مولوی شبیر علی صاحب ہی خاص طور سے نظر ثانی کے محرک بنے کہ انہوں نے اپنے مطبع سے اسکی اشاعت کا قصد کیا تو حضرت سے اس کام کے کر ڈالنے کی خواہش ظاہر کی، جس کا متعلقین کو تو تقاضا تھا ہی حضرت کو بھی خیال تھا اور ضرورت بھی تھی۔ یہ ایڈیشن بھی بارہ دوازدہ اجزاء میں ہے اور آج کل پاکستان میں جو ایڈیشن متداول ہے وہ قرآن کریم و تفاسیر کو شائع کرنے والے مشہور مطبع تاج کمپنی لاہور کا ہے اور ہندوستان میں "تاج پبلشرز دہلی" کا جو "اشرف المطابع" کے نسخہ کا عکس ہونے کی وجہ سے طباعت و کتابت کی صحت و نظافت میں "اشرف المطابع" کے نام کے مطابق "اشرف النسخہ" کہلانے کا مستحق ہے۔

بیان القرآن کے خصائص

حضرت کی یہ تفسیر جس کی نسبت سے خود حضرت نے بڑے اعتماد و ثوق کا اظہار فرمایا ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ اس اعتماد و ثوق کی بنیاد دراصل وہ امور ہیں جن کا حضرت نے اس کی تالیف و ترتیب میں لحاظ فرمایا ہے اور کتاب کے خطبہ میں خود حضرت نے نہایت اہتمام اور پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

محض ضروری مضامین پر اکتفاء

بطور تفسیر محض انہیں مضامین کو ذکر کیا گیا ہے جنہیں کسی وجہ سے ضروری خیال کیا گیا ہے اور ضروری ہونے کی مختلف وجوہ ہو سکتی ہیں:

الف: ایسا مضمون جس پر ترجمہ کی توضیح موقوف ہے۔

ب: قرآن پاک کے ظاہری مضمون سے پیدا ہونے والے کسی شبہہ کا جواب۔

ج: مضمون قرآنی کا بظاہر کسی مشہور و مسلم تحقیق کے خلاف ہونا۔

د: مضمون قرآنی سے نکلنے والا یا اس سے متعلق کوئی فقہی حکم و مسئلہ وغیرہ۔

ایسے مضامین کے امتیاز کے لئے یہ کیا گیا ہے کہ ان کے ذکر سے پہلے حرف (ف) لکھ کر پھر مضمون لکھا گیا ہے۔ کہیں یہ مضامین ایک سلسلۂ مضمون کی تمام آیات کے بعد آئے ہیں، اور کہیں درمیان درمیان۔

(صفحہ ۶ کا بقیہ)

ید طولیٰ حاصل رہا ہے اور ملّت کے بعض حساس قضیوں میں جن کا کردار مشکوک اور منافقانہ رہا ہے ——— امّت کے درمیان جو قدیم فکری اور نظری اختلافات پہلے سے موجود ہیں، اور جن کو اس وقت موضوعِ بحث بنانا محض اسلام کے دشمنوں کو فائدہ پہنچانا ہے۔

محمد رضوان القاسمی

۱۵ ذوالحجہ، ۱۴۱۲ھ

مولانا اشرف علی قاسمی سبیلی
استاذ ومعین مفتی دار العلوم سبیل السلام، حیدرآباد

ملاقات کے آداب — حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شب و روز، صبح و شام، قول و عمل، رفتار و گفتار، اور خلوت وجلوت سب کے سب آداب و اخلاق کا قابلِ تقلید اور بے مثال نمونہ ہیں، قرآن پاک نے اسی کو "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب چند سنتِ نبویؐ پر عمل کا جذبہ رکھنے والے اصحابِ دل نے آپؐ کے اخلاق اور شب و روز کے معمولات کے بارے میں دریافت کیا تو ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے برجستہ فرمایا: "کان خلقہ القرآن" کہ آپؐ کے اخلاق قرآن مجید کی عملی نقشہ گری سے عبارت ہیں —— نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا ادنیٰ طالب علم بھی سیرت نبویؐ کے مطالعہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس فرمان کا چشمِ دل سے مشاہدہ کرسکتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اعزہ اقارب، دوستوں اور بھائیوں سے ملاقات کرنے اور مریض کی عیادت و خبر گیری کو فضیلت کا عمل اور ثواب کا کام قرار دیا ہے، حدیث میں آتا ہے کہ جس نے کسی مریض کی عیادت کی اور اپنے دینی بھائی سے ملاقات کو گیا، ایک ندا دینے والا ندا دیتا ہے کہ تم اچھے ہو، تمہارا آنا مبارک ہے! تم نے جنت میں اپنا گھر بنا لیا[1]، آپؐ سے دوستوں اور اقرباء سے ملاقات کے کچھ آداب منقول ہیں، ذیل میں ان ہی کا تذکرہ مقصود ہے۔

اجازت لینے کی اہمیت

شریعت کی اہم ترین تعلیمات میں سے یہ ہے کہ کسی کے یہاں جانے سے قبل صاحبِ خانہ

(۱) ترمذی، عن ابی ھریرۃ، باب ماجاء فی زیارۃ الاخوان۔

سے اجازت لی جائے، سورۂ نور میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا یھا الذین اٰمنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا وتسلموا علیٰ اھلھا ذٰلکم خیر لکم لعلکم تذکرون ۝ فان لم تجدوا فیھا احدًا فلا تدخلوھا حتی یؤذن لکم وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا ھو ازکیٰ لکم واللہ بما تعملون علیم ۝ (نور/۲۸-۲۷)

اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو، جب تک کہ اجازت نہ حاصل کرلو اور ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو، یہی تمہارے لئے بہتر ہے، تاکہ تم خیال رکھو، پھر اگر ان گھروں میں تم کو کوئی نہ معلوم ہو تو ان گھروں میں نہ جاؤ، جب تک کہ تم کو اجازت نہ دی جائے، اور اگر تم سے یہ کہہ دیا جائے کہ لوٹ جاؤ، تو تم لوٹ آیا کرو، یہی بات تمہارے لئے بہتر ہے، اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے اعمال کی سب خبر ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا گیا کہ:

اذا بلغ الاطفال منکم الحلم فلیستاذنوا کما استاذن الذین من قبلھم ۝ (نور/۱۵۹)

جس وقت تم میں سے وہ لڑکے حد بلوغ کو پہنچیں تو ان کو بھی اسی طرح اجازت لینا چاہئے، جیسا کہ ان سے اگلے لوگ اجازت لیتے ہیں۔

کتنی بار آواز دی جائے

جب کسی کے یہاں جائے تو تین مرتبہ اجازت مانگے، آپؐ کی عادتِ شریفہ بھی یہی تھی کہ صاحبِ خانہ سے تین مرتبہ اجازت لیتے، اگر اجازت مل جاتی تو اندر تشریف لے جاتے، ورنہ آپؐ باہر ہی باہر لوٹ جاتے[۱]۔

آپؐ نے نہ صرف یہ کہ اس پر خود عمل کیا، بلکہ اپنے اصحابؓ کو بھی استیذان کی تعلیم دی تھی، اور اس پر عمل پیرا ہونے کی سختی سے تاکید فرماتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی کے یہاں جاؤ تو پہلے اجازت طلب کرو، اگر ایک بار میں اجازت نہ ملے تو دو بارہ

---

(۱) زاد المعاد ۳۱/۲ - فصل فی ھدیہ فی الاستیذان۔

مانگو، دوبارہ بھی اجازت نہ ملے تو سہ بارہ اجازت مانگو اور تین بار میں بھی اجازت نہ ملے تو واپس لوٹ جاؤ۔[۱]

اس سلسلہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا واقعہ کتب حدیث میں کثرت سے آیا ہے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں تشریف لے گئے، اندر آنے کی اجازت طلب کی، پہلی بار جواب نہیں ملا تو دوسری اور تیسری بار اجازت چاہی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جواب نہ پاکر لوٹ آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوموسیٰؓ کے لوٹ جانے کا احساس ہوا تو دربان سے دریافت کیا کہ کہاں گئے؟ دربان نے جواب دیا کہ وہ تو لوٹ گئے، فرمایا کہ ان کو بلاؤ، دربان بلا لایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے استفسار فرمایا، تم گھر کیوں نہیں آئے، حضرت ابوموسیٰؓ نے عرض کیا: میں نے آپ سے تین بار اجازت مانگی، لیکن جواب نہ پاکر خاموش لوٹ گیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الاستیذان ثلاث، فان اذن لك والا فارجع۔	تین مرتبہ اجازت لینا ضروری ہے، اگر مل جائے تو اندر چلے جاؤ اور اجازت نہ ملے تو لوٹ جاؤ۔

میں نے اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے لوٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔[۲]

اجازت لینے کا حکم اس وقت ہے جب خود ہی بغیر بلائے ملاقات کے لئے گیا ہو، اگر کسی کو خود صاحبِ خانہ ہی نے بلایا ہو تو اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔[۳] کوئی شخص گھر کے دالان میں بیٹھا ہو اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینی ضروری نہیں۔[۴] اسی طرح دکانوں اور دیگر مقامات میں بھی اجازت ضروری نہیں ہے۔[۵]

یہ ضرور پیش نظر رہے کہ اگر کسی کو غیر محرم عورت سے ملاقات کرنی ہو تو صرف اس عورت سے اجازت لینا کافی نہیں، بلکہ شوہر سے بھی اجازت لینا ضروری ہے۔ حضرت عمرو بن عاصؓ کے غلام سے مروی ہے کہ حضرت عمرو بن عاص نے انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس اسماء بنت عمیس سے کچھ

---

(۱) بخاری عن ابی سعید الخدری۔ باب التسلیم والاستیذان ثلثا۔

(۲) ترمذی عن ابی سعید الخدری باب ماجاء فی ان الاستیذان ثلاث۔

(۳) الادب المفرد، باب دعاء الرجل اذنه۔ (۴) الادب المفرد باب مالا یستاذن فیه۔

(۵) الادب المفرد باب الاستیذان فی حوانیت السوق۔

ضروری گفتگو کے لئے اجازت لینے کے لئے بھیجا، حضرت علیؓ نے اجازت مرحمت فرمادی، جب حضرت عمرو بن عاصؓ گفتگو سے فارغ ہو گئے تو ان کے غلام نے اس عمل کے بارے میں دریافت کیا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ حضرت عمرو بن عاصؓ نے فرمایا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں شوہر کی اجازت کے بغیر عورتوں کے پاس جانے اور گفتگو کرنے سے منع فرمایا ہے، اس لئے ہم نے اجازت لے کر اسماء سے گفتگو کی۔(۱)

پردہ کا خیال

اجازت لیتے وقت دروازہ کے بیچ میں نہیں کھڑا ہونا چاہئے، بلکہ دروازہ کے دائیں، یا بائیں کھڑا ہو، تاکہ اندرونِ خانہ نظر نہ پڑے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب بھی کسی کے یہاں تشریف لے جاتے تو اجازت لینے سے پہلے دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہوتے تھے، سامنے کھڑے نہیں ہوتے تھے، ایک بار ایک صاحب آئے اور آپؐ کے دروازہ کے سامنے کھڑے ہو گئے، تو آپؐ نے فرمایا کہ دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو۔ اجازت لینے کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے، تاکہ گھر کے اندر نگاہ نہ پڑے۔(۲)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے گھر میں بلا اجازت تاک جھانک کرنے والوں پر سخت برہمی کا اظہار فرمایا ہے، فرمایا کہ جو شخص کسی کے گھر میں بلا اجازت دیکھے، تاک جھانک کرے اور گھر کی مستورات پر اپنی نگاہ دوڑائے تو وہ سزا کا مستحق ہے، جس وقت اس نے نگاہ دوڑائی، اگر صاحب خانہ دیکھ لیتا اور اس پر اس کی آنکھیں پھوڑ دیتا تو اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی، ہاں اگر گھر کے دروازہ پر کوئی پردہ نہ ہو اور راہ گیر کی نگاہ گھر کے اندر پڑ جائے تو اس میں اس پر کوئی گناہ نہیں، خود صاحب خانہ گنہگار ہوگا کہ اس نے گھر میں پردہ کیوں نہیں لگایا۔(۳)

ایک بار کسی کو آپؐ نے گھر میں جھانکتے ہوئے دیکھ لیا، آپؐ اس وقت کنگھی کر رہے تھے،

---

(۱) ترمذی عن مولیٰ عمرو بن العاص باب ماجاء فی النہی عن الدخول علی النساء الا باذن ازواجھن۔ (۲) ابوداؤد عن طلحہ باب فی الاستیذان۔
(۳) ترمذی عن ابی ذر باب الاستیذان قبالۃ البیت۔

فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو میں اس کنگھی سے تمہاری آنکھ پھوڑ دیتا۔ اجازت لینے کا حکم تو اسی لئے دیا گیا ہے کہ نگاہ کی حفاظت ہو۔[۱]

پہلے سلام کرے

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے سلام کرے پھر اجازت طلب کرے کہ کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ اجازت لینے میں بھی ناشائستہ اور غیر مہذب انداز اختیار نہ کرے، بنو عامر کا ایک شخص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، اس نے سلام کئے بغیر دروازہ سے آواز لگائی "أألج" کیا میں داخل ہو جاؤں؟ اس بدویانہ انداز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدرے ناراض ہوئے اور اپنے خادم سے فرمایا کہ اس کو اجازت لینے کے آداب اور طریقے سکھاؤ، کہ پہلے سلام کرے، پھر اجازت طلب کرے۔ اس شخص نے سن لیا اور اسی طرح اجازت طلب کی اب حضورؐ نے اندر آنے کی اجازت مرحمت فرمائی[۲] خود آپؐ کا مبارک معمول بھی یہی تھا کہ جب کسی کے یہاں تشریف لے جاتے تو پہلے سلام کرتے، پھر اندر جانے کے لئے اجازت لیتے۔[۳]

اپنے نام کی وضاحت

اجازت لیتے وقت صاحبِ خانہ کے نام دریافت کرنے پر "میں ہوں" نہیں کہنا چاہیے بلکہ اس وقت اپنا پورا نام بتانا چاہیے، کہ اگر وہ آواز سے شناخت کر سکتا تو یہ دریافت ہی کیوں کرتا؟ شبِ معراج میں آسمانی سفر کے وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک آسمان سے دوسرے آسمان پر چڑھنا چاہا تو ہر آسمان پر پوچھا گیا کہ تم کون ہو؟ حضرت جبرئیلؑ نے اشرف الملائکہ ہونے کے باوجود "میں ہوں" نہیں کہا، بلکہ جواب میں "میں جبرئیل ہوں" فرمایا[۴]۔ حضرت ابو ذرؓ فرماتے

---

(۱) بخاری عن سہل بن سعد ساعدی، باب الاستیذان من اجل البصر۔

(۲) ابو داؤد عن ربعی بن حراش۔ باب فی الاستیذان۔

(۳) زاد المعاد - ۲/۲۳۔

(۴) مسلم عن انس، باب الاسراء برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی السموات۔

ہیں۔ ایک رات میں گھر سے نکلا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو راستہ پر تنہا چلتے ہوئے دیکھا۔ میں آپؐ کے سایہ میں چلنے لگا، آپؐ نے پلٹ کر دیکھ لیا، آپؐ نے فرمایا کون ہو؟ میں نے جواباً عرض کیا کہ میں ابو ذرؓ ہوں[1]، آپؐ غسل فرما رہے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ پردہ کئے ہوئے تھیں، اتنے میں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا آئیں، آپؐ نے پوچھا کون؟ حضرت ام ہانی نے جواب دیا، میں ام ہانی ہوں۔

ایک بار حضرت جابر رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اجازت حاصل کرنے کے لئے دروازہ کھٹکھٹایا، آپؐ نے دریافت فرمایا: کون ہو؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے جواباً کہا: "میں ہوں میں" آپؐ نے جواب کے اس انداز پر ناراضگی کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ میں میں کیا ہوتا ہے؟[2]

غرض سنتِ نبویؐ یہی ہے کہ اجازت طلب کرنے میں نام پوچھا جائے تو وضاحت کے ساتھ نام بتادئے جائیں، صرف "میں" کہنے پر اکتفا نہ کیا جائے۔

محرم رشتہ داروں کے لئے خصوصی رعایت

یہ آداب ان لوگوں کے لئے تھے، جو اجنبی اور غیر محرم ہوں، لیکن جو لوگ محرم رشتہ داروں میں ہوں، جن سے پردہ ضروری نہیں اور وہ ہمیشہ گھروں میں آتے جاتے ہوں، مثلاً باپ، بھائی، کم عمر بچے وغیرہ، وہ لوگ عام اوقات میں اجازت لے کر آنے کے پابند نہیں کہ اس میں بڑی دقت اور دشواری پیش آئے گی۔ البتہ وہ خاص اوقات جن میں عام طور پر لوگ ستر پوشی کا اہتمام نہیں کرتے محرم رشتہ دار اور ان لوگوں کے لئے بھی اجازت لینے کا حکم ہے، قرآن پاک نے ان اوقات کا ذکر کیا ہے، ایک عشاء کے بعد سے صبح تک کہ یہ معمولی کپڑوں میں سونے کا وقت ہے، اور دوسرے دوپہر کو کہ جب قیلولہ کیا جائے کہ اس وقت بھی ستر پوشی کا پورا پورا اہتمام نہیں کیا جاتا — ان اوقات میں محارم مردوں کو بھی اجازت لینا ضروری ہے — چنانچہ ایک

---

(۱) مسلم عن ابی ذرؓ۔

(۲) بخاری عن محمد بن المنکدر، باب اذا قال من ذا فقال انا۔

صحابیؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے دریافت کیا کہ کیا اپنی ماں سے ملنے کے لئے بھی مجھے اجازت لینا ضروری ہے؟ آپؐ نے اثبات میں جواب دیا، انہوں نے حیرت کے ساتھ پھر سوال کیا کہ میں تو ان کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتا ہوں، پھر بھی اجازت لینی پڑے گی؟ آپؐ نے فرمایا کہ اجازت لے لیا کرو۔ پھر استفسار کیا، میں ان کی خدمت کرتا رہتا ہوں تو جب جب میں جاؤں ان سے اجازت لے لوں؟ آپؐ نے فرمایا کہ تم اپنی ماں کو برہنہ دیکھنا پسند کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، میں کیسے اس کو پسند کرسکتا ہوں؟ آپؐ نے فرمایا کہ تو پھر اجازت لے لیا کرو[1]

سلام اور اس کی اہمیت

مذاہبِ عالم میں ملاقات کے وقت خوشی ومسرت کے اظہار کے لئے کوئی نہ کوئی کلمہ کہنے کا پہلے بھی رواج رہا ہے اور اب بھی ہے۔ ہندو بھائی "نمستے" یا آداب کہتے ہیں، انگریز اور اہلِ یورپ صبح کے وقت "گڈ مارننگ" (Good Morning) دوپہر کے وقت "گڈ آفٹرنون" (Good Afternoon) اور شام کے وقت "گڈ ایوننگ" (Good Evening) کہتے ہیں۔ ایرانی تہذیب میں پہلے "ہزار سال بزی" کہا جاتا تھا، یعنی ہزار برس جیتے رہو۔ اہلِ عرب "انعم اللہ بك علینا" یا "انعم اللہ بك صباحًا" کہتے تھے، یعنی تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں، تمہاری صبح خوشگوار ہو۔

لیکن جب دنیا کے افق پر اسلام کا ستارہ طلوع ہوا، تو اس نے اہلِ ایمان کے لئے ان سے ممتاز طریقہ سکھلایا اور تعلیم دی کہ مسلمان جب آپس میں ملیں تو باتیں کرنے سے پہلے سلام کے ذریعہ محبت کا اظہار کریں[2]، کہ یہ انبیاء کرامؑ کی سنت رہی ہے، ان میں مذہبی شان بھی ہے اور ذکر و عبادت بھی ہے، امن و آشتی اور سلامتی و دعاء کا پیام بھی ہے، اور مسلمانانِ عالم کی واضح شناخت بھی، نیز صد ہا بے گانگی کے باوجود تعلق کی علامت اور خلوص و محبت کا پیغام بر بھی ــــ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوسکتے، جب تک تم

---

(۱) در منثور، ۱۲/۲۲۔

(۲) ترمذی عن جابر بن عبداللہ باب السلام قبل الکلام۔

ایمان نہ لے آؤ اور تم حقیقی ایمان والے اس وقت تک نہیں ہو سکتے، جب تک کہ آپس میں محبت نہ کرنے لگو اور میں ایک ایسی چیز تم کو کیوں نہ بتا دوں کہ اگر تم ان پر عمل کرو گے تو آپس میں محبت کرنے لگو گے، وہ یہی ہے کہ آپس میں سلام کو عام کرو(۱)۔ آپ نے فرمایا کہ تم میں بہتر وہ شخص ہے جو سلام میں پہل کرے(۲)۔

سلام کے الفاظ و کلمات

سلام میں پہل کرنے والے کی طرف سے جس طرح کا سلام ہوا ہو، ارشادِ خداوندی کے مطابق اسی طرح کا، بلکہ اس سے بہتر جواب دینا چاہئے (نساء/۸۶) پہل کرنے والا پورا سلام کرے، اور جواب دینے والا صرف "السلام علیکم" کہہ دے تو جواب مکمل ہو جاتا ہے۔ تاہم افضل یہی ہے، کہ پوری طرح جواب دے کہ آپ نے سلام میں بعض الفاظ بڑھانے کو ثواب کا باعث قرار دیا ہے ایک مرتبہ ایک شخص آپ کی خدمت میں آیا اور "السلام علیکم" کہہ کر بیٹھ گیا، آپ نے فرمایا کہ اس کو دس نیکیاں ملیں۔ دوسرا شخص آیا اور "السلام علیکم ورحمۃ اللہ"، کہہ کر بیٹھ گیا، آپ نے فرمایا کہ اس کو بیس نیکیاں ملیں۔ تیسرا شخص آیا اور اس نے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"، کہہ کر بیٹھ گیا' آپ نے فرمایا کہ اس کو تیس نیکیاں ملیں(۳)۔

سنت نبوی کے اہتمام میں کمی اور مغربی تہذیب سے مرعوبیت کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک طبقہ میں اور خصوصیت سے نئی نسل کے نوجوانوں میں سلام کے مسنون اور دعائیہ کلمات کے بجائے عمومی قسم کے تہنیتی یا دعائیہ کلمات کا رواج بڑھتا جا رہا ہے، یہ ایک غیر اسلامی رجحان ہے، نہ ان تعبیرات میں سلام کی سی جامعیت ہے اور نہ اس کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ادا ہو پاتی ہے، جو ایک مسلمان کے لئے سب سے بڑی سعادت ہے۔

---

(۱) ابن ماجہ عن ابی ہریرۃ۔ باب افشاء السلام۔ (۲) ترمذی عن عمران بن حصین باب ما ذکر فی فضل السلام۔
(۳) ابوداؤد عن سہل بن معاذ، باب کیف السلام ——— بعض روایتوں میں آتا ہے کہ چوتھا شخص آیا، اور اس نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' ومغفرتہ' کہا، آپ نے فرمایا کہ اس کو چالیس نیکیاں ملیں، ابوداؤد عن سہل بن سعد باب کیف السلام۔ تاہم اس روایت کے بارے میں محدثین نے لکھا ہے کہ اس کی سند میں ابو مرحوم عبدالرحمٰن بن میمون ہیں اور سہل بن معاذ ہیں۔ اور ان کی روایتوں سے استدلال درست نہیں۔ لایحتج بہما ——— عون المعبود ۱۴/۱۰۳

اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "السلام علیکم" کے علاوہ دوسرا کلمہ کہنے سے منع فرمایا ہے۔ ایک صحابیؓ حضورؐ کی خدمت میں آئے اور "علیک السلام یا رسول اللہ" کہا۔ آپؐ نے سلام کی اس تعبیر سے منع فرمایا اور فرمایا "علیک السلام"، مت کہا کرو کہ یہ مردوں کا سلام ہے[1]۔ کیونکہ مردے سلام کا جواب نہیں دے سکتے اور یہ سلام کی جوابی تعبیر ہے، جس کے جواب کی گنجائش نہیں۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کے وقت ہاتھ اٹھانے سے بھی منع فرمایا کہ یہ غیروں کا شعار ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ دوسروں کا تشبہ اختیار کرنے والے ہم میں سے نہیں، یہود اور نصاریٰ کی مشابہت مت اختیار کرو کہ یہود انگلیوں کے اشارہ سے سلام کرتے ہیں اور نصاریٰ ہتھیلیوں کے اشارے سے[2]۔ تاہم اگر آدمی دور ہو تو سلام کرتے وقت زبان سے السلام علیکم کہتے ہوئے ہاتھ سے بھی اشارہ کرنے کی گنجائش ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی اس طرح سلام کرنا منقول ہے[3]۔

سلام کسے کیا جائے؟

سلام میں چھوٹے بڑے کی قید نہیں اور نہ ہی مرد و عورت کی، نہ شناسا اور ناشناس کی تفریق ہے بلکہ سلام ہر ایک کو کیا جانا چاہئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ ہمارا گذر بچوں کے پاس سے ہوا تو آپؐ نے بچوں کو سلام کیا[4]۔ حضرت اسماءؓ بنت یزید فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم عورتوں کے پاس سے گذرے تو آپؐ نے ہم عورتوں کو سلام کیا[5]۔ کسی نے آپؐ سے سوال کیا کہ بہتر اسلام کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ محتاجوں کو کھانا کھلاؤ، اور جانے ان جانے سبھوں کو سلام کرو[6]۔ آپؐ نے صرف دوسرے سے ملاقات کے وقت سلام کرنے کا حکم نہیں فرمایا۔ بلکہ آپؐ نے گھر میں آتے جاتے وقت بھی سلام کرنے کی تعلیم دی۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ، باب من کان یکرہ ان یقول علیک السلام۔
(۲) ترمذی، باب ماجاء فی کراہیۃ اشارۃ الید فی السلام۔
(۳) دلیل الفالحین عن اسماء بنت یزید، باب کیفیۃ السلام۔
(۴) ترمذی عن یسار، باب ماجاء فی التسلیم علی الصبیان
(۵) ابوداؤد عن اسماء، باب فی السلام علی النساء
(۶) بخاری عن عبداللہ بن عمرو، باب السلام للمعرفۃ وغیر المعرفۃ۔

جب تم گھر جایا کرو تو گھر والوں کو سلام کرو، یہ تمہارے لئے بھی بہتر اور برکت کا ذریعہ ہے اور تمہارے گھر والوں کے لئے بھی۔

تاہم سلام کے بارے میں عموماً نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو باتیں پیش نظر رکھی ہیں، ایک یہ کہ چھوٹا بڑے کے ادب واحترام کا خیال و لحاظ کرے، دوسرے تواضع وانکساری کا اظہار کیا جائے، اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرے، سواری پر چلنے والا پیدل چلنے والے کو اور چلنے والا بیٹھے ہوئے لوگوں کو سلام کرے۔ نیز تھوڑے لوگ زیادہ لوگوں کو سلام کریں۔(۱) مجلس سے آتے جاتے وقت بھی حضورؐ نے سلام کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی کسی مجلس میں آئے تو اہلِ مجلس کو سلام کرے اور جب مجلس سے جانا چاہے تو اہلِ مجلس کو سلام کرکے جائے۔(۲)

سلام کرتے وقت دوسروں کی نیند اور آرام کا بھی خیال رکھنا چاہئے، اتنی بلند آواز سے سلام نہ کرے کہ سونے والوں کی نیند میں خلل پڑے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی ایسی جگہ تشریف لے جاتے جہاں کچھ لوگ بیدار ہوں اور کچھ لوگ سوئے ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی آواز میں سلام فرماتے کہ جاگنے والا سلام سن لے اور سونے والوں کی نیند بھی نہ ٹوٹے۔(۳)

جن کو سلام نہیں کرنا چاہیئے

اہلِ کتاب اور ذمیوں سے سلام میں پہل کرنے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، آپؐ نے فرمایا کہ یہود و نصاریٰ کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو۔(۴) ایک مرتبہ کچھ یہود حضورؐ کے پاس آئے اور "السام علیک" (تم پر موت آئے) کہا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں صرف "وعلیکم" فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کے جواب میں "علیکم السام واللعنۃ" کہا

(۱) ترمذی عن سعید بن المسیب۔ باب ماجاء فی التسلیم اذا دخل بیتہ۔
(۲) ابوداؤد عن ابی ھریرہ، باب فی السلام اذا قام من المجلس۔
(۳) ترمذی عن مقداد بن اسود، باب کیف السلام۔
(۴) ترمذی عن مقداد بن اسود، باب ماجاء فی کراھیۃ التسلیم علی الذمی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عائشہ! اللہ تعالیٰ ہر چیز میں نرم روی کو پسند فرماتا ہے۔ یعنی ایسا جواب دینا مناسب نہیں تھا۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپؐ نے وہ بات نہیں سنی جو انہوں نے کہی تھی، آپؐ نے فرمایا کہ میں نے ان کا جواب دے دیا اور صرف "وعلیکم" کہہ دیا۔[1]

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو بھی سلام کرنا ناپسند کیا ہے، جو استنجا میں مشغول ہوں۔ ایک شخص استنجا کر رہا تھا، اسی حالت میں اس نے حضورؐ کو سلام کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔[2]

اجنبی عورتوں کو بھی سلام کرنا شرعاً ممنوع ہے، اس میں فتنہ کا اندیشہ بھی ہے اور خلافِ سنت بھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجنبی عورتوں کو زبان سے سلام نہیں کیا، جہاں تک بعض روایتوں میں حضورؐ کے عورتوں پر سلام کرنے کا ذکر آتا ہے، تو شراح حدیث نے اس کو ہاتھ سے اشارہ کے ذریعہ سلام کرنے پر محمول کیا ہے۔[3] ہاں اگر اجنبی عورتیں بوڑھی ہوں، مشتہاۃ کی عمر سے تجاوز کر چکی ہوں تو ان کو سلام کرنے کی گنجائش ہے۔[4]

مصافحہ

ملاقات کے وقت ہاتھ میں ہاتھ ملانا اور مصافحہ کرنا بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے ہے، اس میں غایت محبت اور کینۂ و بغض سے برارت کا اظہار بھی ہے اور گناہوں کی مغفرت کا باعث بھی، سلام کے بعد مصافحہ کا رواج ابتداءِ اسلام میں مسلمانوں میں نہیں تھا، جب اہلِ یمن مدینہ آئے تو انہوں نے مصافحہ کو رواج دیا۔[5] آپؐ نے ملاقات کے وقت اس طریقۂ کار کی تحسین فرمائی اور فرمایا جب کوئی مسلمان ایک دوسرے سے ملاقات اور مصافحہ کرتا ہے، تو

---

(۱) ابوداؤد ——— (۲) ترمذی عن ابن عمر۔ باب ماجاء فی کراھیۃ التسلیم علی من یبول۔

(۳) زاد المعاد - ۲/۲۶۔

(۴) فقہاء کرام نے جہری تلاوت قرآن، مذاکرۂ علمی، اذان و اقامت اور خطبات جمعہ و عیدین کے وقت بھی سلام کرنے کو مکروہ لکھا ہے۔ عالمگیری ۵/۳۶۶۔

(۵) ابوداؤد عن انس، باب فی المصافحہ۔

اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے[1]۔ نیز آپؐ نے فرمایا کہ مصافحہ تمہارے سلام کا تکملہ ہے[2]، مصافحہ دل کے کینوں اور کدورتوں کو نکال دیتا ہے[3]۔

مصافحہ کا بہترین موقع وہ ہے جب پہلی مرتبہ ملاقات ہو، یہی وجہ ہے کہ فی زمانہ عصر اور جمعہ کی نمازوں کے بعد جس مصافحہ کا عوام میں رواج ہو گیا ہے اسے محدثین نے بدعت قرار دیا ہے، علامہ نوویؒ نے لکھا ہے:

اما ما اعتادہ الناس من المصافحۃ بعد صلوتی الصبح والعصر فلا اصل فی الشرع علی ھذا الوجہ[4]۔

عصر اور فجر کی نمازوں کے بعد مصافحہ کا جو رواج ہو گیا ہے شریعت میں مصافحہ کے اس انداز کی کوئی اصل نہیں ہے۔

اور ابن حجر عسقلانیؒ سے بھی اسی طرح کی وضاحت منقول ہے[5]۔

مسنون طریقہ یہ ہے کہ مصافحہ دونوں ہاتھ سے کیا جائے اور کپڑے وغیرہ کے واسطہ کے بغیر کیا جائے۔ حماد بن زید کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن مبارک سے دونوں ہاتھ سے مصافحہ کیا[6]۔ اور امام بخاریؒ نے اس موضوع پر اپنی مشہور تالیف بخاری شریف میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے کہ مصافحہ دونوں ہاتھ سے کرنا چاہئے۔ اس کی تائید میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ میں ان کا ہاتھ پکڑ کر تشہد سکھایا تھا[7]، جس سے نہ صراحۃً تو اشارۃ النص سے ضرور ہی دونوں ہاتھ سے مصافحہ کئے جانے کا ثبوت ملتا ہے ـــــ خصوصاً اس دور میں جب کہ غیر مسلم اقوام ملاقات کے وقت ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا کرتی ہیں، حدیث کے مطابق ان کی مخالفت میں

---

(۱) ترمذی عن براء بن عازب۔ باب ما جاء فی المصافحۃ۔
(۲) ترمذی، عن ابی امامہ، باب ما جاء فی المصافحۃ۔
(۳) مؤطا امام مالک عن عبداللہ الخراسانی۔ باب، ما جاء فی المہاجرۃ۔
(۴) عون المعبود۔ ۱۴/۱۲۰۔
(۵) رد المحتار، ۵/۲۴۴۔
(۶) بخاری ۲/۹۲۶۔ باب الاخذ بالیدین۔
(۷) بخاری، باب المصافحۃ۔ ۲/۹۲۶۔

دونوں ہاتھ سے مصافحہ کرنے کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

معانقہ

مصافحہ کے بعد معانقہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں میں سے ہے، آپؐ نے ملاقات کے بعد اپنے کئی اصحابؓ سے معانقہ بھی فرمایا اور اس کو بنظر تحسین دیکھا ہے، اسلئے چھوٹوں پر شفقت، بڑوں کی تعظیم واکرام کے لئے معانقہ کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ مستحب اور مسنون بھی ہے غزوۂ خیبر کے موقع پر آپؐ کو ایک طرف فتح خیبر کی خوشی تھی، تو دوسری طرف چچا زاد بھائی حضرت جعفرؓ کی حبشہ سے آمد نے اس مسرت کو دوگانہ کردیا، آپؐ نے حضرت جعفرؓ سے ملاقات کے وقت سلام وکلام کے بعد معانقہ بھی فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ میں نہیں سمجھ پارہا ہوں کہ فتح خیبر کی مجھے زیادہ مسرت ہے یا حضرت جعفرؓ سے ملاقات کی خوشی زیادہ ہے"(۱) اسی طرح حضرت زیدبن حارثہؓ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپؐ نے فرطِ مسرت سے ان کو گلے لگالیا"(۲)

یہ اسلام ہی کا خصوصی وصف ہے کہ اس نے مسلمان کی زندگی کے ہر لمحے اور ہر عمل کو خالص اللہ کی عبادت اور ذکر ودعا قرار دیا ہے، عبادات ہوں یا معاملات، معاشرتی احکام ہوں یا سماجی مسائل، تمام ہی امور میں عبادت اور ذکر ودعا کے پہلو کو نمایاں کیا ہے —— سلام اور آدابِ ملاقات میں بھی اسلام نے اپنے اس مزاج کی خاص رعایت برتی ہے، اس کو بھی عبادت بنا دیا ہے، یوں ہی سامانِ تفریح اور رسمی گفتگو نہیں بنایا ہے۔ دوسرے مذاہب کی طرح ملاقات کے وقت صرف ظاہری خیریت کی دریافت ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ وہ چیز سکھائی کہ جب ملاقات ہو مسرت اور خوشی کے اظہار کے ساتھ ساتھ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو سلامتی وعافیت کی دعا دے۔ فللّٰہ الحمد علیٰ ذالک۔

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ عن الشعبی، باب فی المعانقہ۔

(۲) ترمذی عن عائشہؓ، باب ماجاء فی المعانقہ والقبلۃ۔

جمعہ قائم کرنے کی شرطیں اور دیہات میں نمازِ جمعہ کا مسئلہ

- مکتوب : حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ۔
- ترجمہ: مولانا محمد سیف اللہ قاسمی، استاذ دار العلوم، حیدر آباد۔

ماضی قریب کے بزرگوں میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، بانی دار العلوم دیوبند کا جو پایۂ علمی تھا، اس سے ہندوستان کا کون عالم بے خبر ہوگا؟ حضرت والا کی سب سے بڑی خصوصیت استنتاج اور استنباط کی غیر معمولی اہلیت اور قابلیت تھی اور اسی لئے وہ بجا طور پر "حجۃ الاسلام" سے ملقب ہوئے۔ "فیوض قاسمیہ" میں "جمعہ کی شرائط" پر آپ کا ایک نہایت قیمتی فارسی مکتوب ہے جس میں کمال ذہانت کے ساتھ جمعہ سے متعلق آیت سے تمام ہی "شرائطِ جمعہ" کو ثابت کیا گیا ہے، پھر دیہات میں نمازِ جمعہ اور جمعہ کے لئے سلطان یا نائب سلطان کی شرط پر ایک نئے اور اچھوتے انداز سے بحث کی گئی ہے اور دیہات و قریہ جات میں بھی نمازِ جمعہ کی اجازت دی گئی ہے، نیز اختلافِ امت سے فائدہ اٹھانے اور اسے صحیح معنوں میں رحمت بنانے کی تلقین کی گئی ہے اور علت و حکمت میں ہم آہنگی برقرار رکھنے کی سعی کی گئی ہے ____ مولانا سیف اللہ قاسمی صاحب نے مکتوب کا رواں اور سلیس ترجمہ کیا ہے۔ قارئینِ "صفا" کے استفادہ کے لئے پیش ہے۔ امید ہے اہلِ علم و نظر اس سے خوب حظ اٹھائیں گے ____ رحمانی

مقصود سے پہلے بطور تمہید چند ضروری باتیں۔

(۱) خطاب عام، مراد خاص

ہر قوم اور زبان میں بکثرت خطاب کرنے کے لئے عام القاب استعمال کئے جاتے ہیں، اور مخاطب خاص مراد ہوتے ہیں۔ مثلاً بولتے ہیں، مولوی صاحب، شیخ صاحب، مرزا صاحب، منشی صاحب وغیرہ، جو عام القاب ہیں، لیکن مقصود ایک شخص سے زائد نہیں ہوتا ____ اسی طرح قرآن و حدیث میں بھی اکثر جگہوں پر یہی طرز اختیار کیا گیا ہے، مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ" اس میں حکم زکوٰۃ کا خطاب عام ہے، مگر مخاطب صرف اغنیاء ہیں، نہ کہ فقراء ____ اسی طرح

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یا ایھا النبی، یا ایھا الرسل سے خطاب کیا گیا اور ظاہر ہے کہ یہ لقب صرف آپؐ کا نہیں، بلکہ تمام انبیاء اور رسولوں کا ہے، لیکن یہاں صرف آپؐ مراد ہوتے ہیں۔ غرض یہ اندازِ تخاطب ہر قوم اور ہر زبان میں عام ہے، کسی کی تخصیص نہیں،

(۲) قرائن سے تعیین

متکلم اگرچہ عمومی خطاب کرے، مگر مخاطب اس کے طرز و انداز اور اشارے سے یہ جان لیتا ہے کہ متکلم کے کلام کا رخ میری جانب ہے، ایسے ہی جیسے شیوخ و سادات کے دو یا زائد افراد ایک ساتھ بیٹھے ہوں، ان میں سے ایک نابینا ہو، اور ان کے جاننے والے آنکھ کان کے حالات سے واقفیت کے باوجود میر صاحب، شیخ صاحب جیسے عام خطاب سے مخاطب کرے، دیکھیے یا سنئے کہے تو ہر عقلمند آدمی بلا تامل یہ سمجھ لے گا کہ اس کی مراد فلاں ہے، فلاں نہیں، اسی طرح مخاطب بالیقین سمجھ جاتا ہے کہ متکلم کے اشارے کا محل میں ہوں دوسرا نہیں۔

(۳) شرط اور مشروط کا رشتہ

اللہ تعالیٰ یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی حکم کو شرطوں کے ساتھ مربوط کردیں تو اس شرط و حکم میں ایسا ہی تعلق ہوتا ہے، جیسے موقوف و موقوف علیہ کا ہوتا ہے، شرط موقوف علیہ ہوتی ہے اور حکم موقوف۔ لہٰذا اگر وہ حکمت جو اس شرط کے متعلق ہونے سے مقصود تھی ختم ہو جائے، یا وہ حکمت شرط کے بغیر ہی حاصل ہو جائے تو کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس شرط کو لغو قرار دے، یا اس حکم کو اس شرط سے مربوط نہ کرے، یا اس حکم کو اس شرط پر موقوف نہ سمجھے۔

مسئلہ جمعہ

مثلاً جمعہ کی شرطوں میں سے ایک شرط جماعت ہے، جس کی حکمت اس کے علاوہ

اور کیا ہو سکتی ہے کہ کہا جائے کہ مقصود وعظ و خطبہ کا سننا اور سنانا ہے، اگر جماعت کی شرط نہ لگائی جائے تو ممکن ہے کہ لوگ فراہم نہ ہوں، اس وقت تنہا واعظ گو ہو گا، اور سامع کوئی بھی نہ ہو گا۔ لہٰذا مقصود اصلی جو سننا سنانا ہے، لوگوں کے آنے سے حاصل ہوتا ہے لیکن عقلاً نمازِ جمعہ کی صحت جماعت پر موقوف نہیں، اس طرح کہ لوگ آئیں اور خطبہ سنیں اور تنہا تنہا اپنی نماز پڑھ کر چلے جائیں، یا اور کہیں چلے جائیں اور وہاں نماز با جماعت ادا کر لیں تو اس صورت میں مقصود اصلی حاصل ہو جاتا ہے، مگر مجھے معلوم نہیں کہ کسی نے اس صورت کے جواز کا فتویٰ دیا ہو۔

اہلیت جمعہ کی شرطیں

اس تمہید کے بعد اصل مقصد پر آئیے، فرمانِ باری تعالیٰ ہے: یاایھاالذین امنوا اذا نودی لصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ (اے مومنو! جب جمعہ کے دن اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو) اس میں جو خطاب عام مومنوں کو ہے، اس عمومی خطاب کی وجہ سے یہ حکم ہر شخص کو عام ہے، مسافر ہو یا مقیم، تندرست ہو، یا بیمار، غلام ہو یا آزاد، بچہ ہو یا جوان مرد ہو یا عورت، مگر سیاق آیت "فاسعوا" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کے مخاطب صرف وہی مسلمان ہیں، جو آزاد، مرد، تندرست، مقیم، جوان اور خود مختار ہوں، تفصیل یہ ہے کہ سعی (دوڑنا) مردوں اور تندرست ہی سے مطلوب ہو سکتی ہے، عورتوں اور بیماروں سے یہ مطالبہ نہیں ہو سکتا، بیماروں کا حال معلوم ہی ہے، کمزور طاقتوروں کا کام کیا جانیں؟ رہیں عورتیں، تو ان کے لئے: "ولا یضربن بارجلھن" (اپنے پاؤں نہ ماریں) کا خطاب مانع ہے، ان کو خانہ نشینی کی تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہے: "وقرن فی بیوتکن" اور سعی کی وجہ سے محل زینت کا انکشاف یقینی ہے، کیونکہ اس کی بنا پر گلی کوچوں میں دوڑ دھوپ بھی عورتوں پر لازم ہو گی، جس کی وجہ سے بعید نہیں کہ چہرہ سے نقاب اور پنڈلی سے شلوار ہٹ جائے، اور "وذروا البیع" کا خطاب اس کا متقاضی ہے کہ مخاطب کو خرید و فروخت کا اختیار حاصل ہو، ورنہ اس قید کا کوئی فائدہ نہ ہو گا، اور ظاہر ہے کہ

غلام اس کام کا اہل نہیں اور نہ ہی بچوں کو اس کا اختیار ہے، اسی بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد میں چار لوگوں کا استثناء فرمایا:

الجمعۃ حق واجب علی مسلم فی جماعۃ الا اربعۃ عبد مملوك او امراۃ او صبی او مریض۔	جمعہ با جماعت ہر مسلمان پر واجب ہے سوائے چار اشخاص کے۔ غلام، عورت، بچہ اور بیمار۔

(ابوداؤد باب الجمعۃ للمملوک والمراۃ)

اگر عہد نبوی ؐ کی اذان جمعہ پر نگاہ ڈالیں تو مسافروں کے لئے سفر کی اجازت کا مسئلہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

خطبۂ جمعہ کی حکمت

اس کی تفصیل یہ ہے کہ عہد نبوی ؐ میں جمعہ کی اذان اس وقت ہوتی تھی جب خطیب ممبر پر جا بیٹھتا تھا، اسی لئے اذان سنتے ہی خرید و فروخت ترک کر کے جمعہ کا خطبہ سننے کے لئے دوڑنا واجب تھا، جیسا کہ "الی ذکر اللہ" سے معلوم ہوتا ہے، کیونکہ یہاں ذکر سے مراد خطبۂ جمعہ ہے، جو خطیب وامام پر واجب ہے اور خطبۂ جمعہ کے سننے کے فضائل اور شور و شغب جو سننے میں مخل ہوتے ہیں اس کی کراہت پر غور کرتا ہوں تو اس کی علت بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ جمعہ کے دن مقصود اصلی وعظ و خطبہ سننے کے واسطے لوگوں کو جمع کرنا ہے، اسی لئے فامشوا (چلو) کے بجائے "فاسعوا" کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ اشارۂ خداوندی سمجھنے والوں کو ذہن نشیں ہو جائے کہ مقصود اصلی وعظ سننا ہے۔ اگر نازنیں چال سے خراماں خراماں جائیں گے تو خطبہ کے برکات سے محروم ہو جائیں گے۔

اذان اوّل کا فائدہ

شاید یہی وجہ تھی کہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اذانِ خطبہ سے

پہلے دوسری اذان کے اضافے کا حکم فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سامعین دیر سے پہونچیں اور خطبہ بیکار ہو جائے، اور اسی لئے عام نمازوں کے مقابلے میں جمعہ کا امتیاز واضح ہو جاتا ہے کہ عام نمازوں میں خطبہ نہیں ہے۔ اسی لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک اذان کو کافی سمجھا، جب کہ جمعہ میں خطبہ واجب ہے، اس لئے ایک اذان کا اضافہ فرمایا تا کہ مقصد پورے طور پر حاصل ہو جائے۔

خطبہ کون دے سکتا ہے؟

لیکن ایک دوسری حدیث حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرماتے ہوئے سنا:

لا یقص الا امیر او مامور او مختال۔ (ابوداؤد)

وعظ امیر کرے، یا اس کا مامور، یا پھر متکبر ہی وعظ کر سکتا ہے۔

اس حدیث میں قصص سے مراد وعظ و خطبہ ہے اور اہل علم جانتے ہیں کہ جہاں وعظ ضروری اور واجب ہوتا ہے، وہاں یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ واعظ خود امیر (بادشاہ) یا نائب ہو، ورنہ وہ بھی متکبرین کے زمرے میں آجائے گا، نیز ظاہر ہے کہ خطبۂ جمعہ جس کو "ذکر اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے، اگر جمعہ فرض ہو تو اس وعظ کی فرضیت بدرجۂ اولیٰ ثابت ہو گی۔

مسافروں کے لئے جمعہ کی رخصت

اور مسافروں کے لئے اس قسم کے وعظ میں شرکت کرنا ممکن نہیں، اس لئے مسافر کو وجوبِ جمعہ کے حکم میں داخل کرنا مشکل ہے، الا یہ کہ سفر کو بالکلیہ طور پر حرام قرار دیا جائے، یا صرف ان اسفار کو جائز قرار دیا جائے، جس میں اس طرح کا وعظ میسر ہونے کے امکانات ہوں، لیکن یہ فتویٰ کسی نے دیا ہے اور نہ دے سکتا ہے، اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ مسافر اس سعی الی الجمعہ سے خارج ہے اور جس طرح

"یاایھا الذین اٰمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ" کے عموم سے اشارۃً مسافر کو خاص کر لیا گیا۔ اسی طرح حدیث مذکور: الجمعۃ حق واجب علی کل مسلم فی جماعۃ میں لفظ جماعت کے عموم سے بھی اشارۃً مسافر کو خارج قرار دیا جائے گا، اس لئے کہ بیچارے مسافر کو جماعت کہاں میسر ہوگی؟ لہٰذا یا تو تنہا سفر کرنا اس پر حرام قرار دیں، یا نماز جمعہ اس پر واجب نہ قرار دیں۔ پہلی صورت بہرحال حرام نہیں ہے تو لامحالہ مسافر پر جمعہ واجب نہ ہونے کا اقرار کرنا پڑے گا۔ رہا یہ کہ تنہا سفر کرنے کی ممانعت آئی ہے، ارشاد ہے: "الواحد شیطان" ایک مسافر شیطان ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو ابتدائے اسلام کی بات ہے (جب دشمنوں کا خدشہ تھا) اور اگر اب بھی یہ حکم باقی ہو تو: "الاثنان فما فوقھا جماعۃ" (دو، یا دو سے زیادہ مسافر جماعت ہے) اس پر دلیل ہے کہ دو آدمیوں کا باہم سفر کرنا جائز ہے، ممنوع نہیں، حالانکہ اس صورت میں بھی شرط پوری نہیں ہوتی، نہ حنفیہ کے نزدیک، نہ شافعیہ کے نزدیک۔

جماعت کی شرط

بلکہ اس قاعدہ کی رو سے اقل جمع تین فرد ہیں: الذین، فاسعوا، ذروا، یہ تینوں الفاظ جمع ہیں، جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ امام کے علاوہ کم از کم تین افراد ہونے چاہئیں، کیونکہ "یاایھا الذین" کے مخاطب سامعین ہیں کہ سعی کر کے وعظ سنیں، امام اس جماعت میں نہیں، کیونکہ جیسا کہ پہلے گذرا، اذان اسی وقت ہوتی ہے، جب خطیب ممبر پر پہونچ چکا ہوتا تھا۔ لہٰذا یہ حکم سامعین کے ساتھ مختص ہوگا، امام اس میں داخل نہ ہوگا۔ اور آیت فاسعوا الی ذکر اللہ اور حدیث لا یقص الا امیر او مامور کے ملانے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ امیر یا مامور کی شرط ضرورت خطبہ ہی کی وجہ سے ہے۔

مصر کی شرط۔ ایک تجزیہ

رہی مصر کی شرط، تو غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی مستقل شرط

نہیں ہے، بلکہ امیر یا مامور کی ضرورت کی دوسری تعبیر ہے، کیونکہ کوئی مصر ایسا نہیں ہوتا جس میں کوئی حاکم نہ ہو، بادشاہِ وقت نہ ہو تو نائب ضرور ہوگا۔ مصر و قریہ، شہر و دیہات کا فرق ایسا نہیں جو محتاجِ بیان ہو، کیونکہ تمام ریاستوں میں دیہات و شہر دونوں پائے جاتے ہیں اور ہر شخص تمیز کر سکتا ہے کہ کون شہر ہے اور کون دیہات؟ البتہ قابلِ ذکر یہ ہے کہ شہر تو کوئی حاکم سے خالی نہیں ہوتا، خود بادشاہ ہو یا اس کا نائب رہے دیہات، میدان اور بیابان تو ان کو یہ کہاں نصیب اور دیہاتوں اور صحراؤں میں وعظ و نصیحت کے لئے جانا بادشاہ اور حاکم کے شایانِ شان بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیہاتوں کو نظر انداز کر کے صرف شہریوں کو سرکاری ذمہ داریاں سونپی جاتی ہیں۔ اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ جمعہ کے جواز کے لئے تین آدمیوں کا ہونا "شہر والی شرط" کے لئے مخل نہیں، جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے، ایک طرف مصر کی شرط، اور دوسری طرف جماعت کے لئے تین آدمیوں کی شرط۔ ظاہر ہے کہ شہر میں تین آدمی کی کیا گنتی ہے؟ مگر معاملہ ایسا نہیں ہے، مصر کی شرط اور تین کی شرط میں کوئی تضاد نہیں ہے، اس لئے کہ مصر کی شرط کسی اور ضرورت کی بناء پر لگائی گئی ہے، جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، یعنی امیر و حاکم کی ضرورت جمع کثیر کی فراہمی کے لئے نہیں ہے، البتہ شہر و مصر کی شرط لگانے میں ضمناً یہ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ شہر میں ہونے والا وعظ عموماً بڑے مجمع میں ہوتا ہے، اس کے ساتھ اہل شہر سمجھدار بھی ہوتے ہیں، تعلیمی قابلیت بھی دیہاتوں کے مقابلے میں انہیں زیادہ ہوتی ہے، بڑے مجمع میں اگر سب نہ مانیں تو یہ بھی کیا کم ہے کہ دو چار آدمی ہی واعظ کے وعظ سے متاثر ہوں اور وعظ و نصیحت کے بعد ان کی صحبت دوسرے لوگوں کو بھی راہِ حق پر لے آئے۔

دیہات کے بارے میں احتیاطی رائے

اب ایک دوسری بات عرض کرتا ہوں، وہ یہ کہ کلام ربانی کے ان اشارات کو سمجھنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں اور احادیث صریحہ بھی اس باب میں حد تواتر کو پہونچی

ہوئی نہیں ہیں۔ اس لئے دیہات کے جمعہ کے بارے میں علماء کی رائیں مختلف ہوگئیں اور وجوب و عدم وجوب کے اس اختلاف کی بناء پر عوام اگر جمعہ میں سستی کریں تو ان کے لئے امید مغفرت کی گنجائش موجود ہے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ کاہلی یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ متعصب حنفی برادری جمعہ کو چھوڑنے لگی اور اس میں سستی کرنے لگی، مگر انہیں یاد نہ رہا کہ : المتقی من یتقی الشبہات۔ (متقی وہ ہے جو شبہات سے بھی پرہیز کرے) کے لحاظ سے دیکھئے تو نہ صرف جمعہ ضروری ہے، بلکہ فرض ظہر بھی واجب ہے۔ اس لئے کہ یہ صحیح ہے کہ بعض شرائط کے فوت ہو جانے کی بناء پر وجوب جمعہ کی قطعیت باقی نہیں رہتی اور نہ اس کے انکار سے کفر لازم آئے گا، مگر ارشاد نبوی : "دع ما یریبك الی مالا یریبك" کا تقاضہ یہ ہے کہ مواقع شک میں ہمیشہ وہ راہ اختیار کرنی چاہیئے جو احتیاط کی ہو۔ اسی لئے دیہات میں احتیاط اسی میں ہے کہ جمعہ کی نماز بھی پڑھ لی جائے اور ظہر بھی ادا کرلی جائے، کیونکہ اتنی بات تو طے ہے کہ دیہات میں جمعہ اور ظہر میں سے کوئی ایک فرض قطعی یقینی ہے، البتہ اس کے تعین میں شک ہے کہ جمعہ فرض ہے یا ظہر فرض ہے، اس لئے احتیاط یہی ہے کہ دونوں کو ادا کرنا چاہیئے، کسی ایک کو ادا کر کے مطمئن نہیں ہونا چاہیئے۔

مثال سے وضاحت

مثال کے طور پر کوئی دیندار آدمی کسی کا مثلاً ایک روپیہ کم و بیش قرض رکھتا ہو اور زمانۂ دراز کے بعد اسے شک ہو جائے کہ پتہ نہیں، ادا کیا یا نہیں؟ یا شروع ہی سے قرض ہونے نہ ہونے میں شک ہو جائے اور قرض دینے والا کوئی حاکم ہو جو دیکھنا چاہتا ہو کہ یہ شخص قرض ادا کرتا ہے یا نہیں؟ تو ایسی صورت میں دینداری کا تقاضا یہ ہے کہ اصل قرض میں شک رہنے کی صورت میں ادا کرے اور مقدار قرض میں شک رہنے کی صورت میں بڑی مقدار ادا کرے۔ اگر قرض دینے والا حق پرست ہو گا تو بقائے قرض کی صورت میں اپنے قرض کے بقدر لے کر باقی واپس کر دے گا۔ زیر بحث صورت میں یہی معاملہ ہے اس لئے مسلمانوں کو دونوں نماز ادا کرنی چاہیئے، حق تعالے اپنا حق قبول کرلیں گے،

اور باقی کا عوض (ثواب) واپس (عطا) کر دیں گے، جو فرض نہیں ہو گا اس کو نوافل کی رو سے قبول فرمالیں گے اور جو ثواب از روئے فضل و کرم نوافل پر ملنا واجب تھا بندوں کی جانکاہی کے مکافات پر عطا فرما دیں گے، لیکن فرائض تو سرکاری حقوق ہیں، یہ خود مطلوب ہیں اس لئے عوض ضروری نہیں، بلکہ فرائض کو سرکاری بقایا کے مانند سمجھنا چاہئے، ایک ذرہ بھی لیتے ہیں تو اس کی قیمت اور عوض ادا کرتے ہیں۔

گاؤں میں جمعہ کا وجوب اور ظہر کی ممانعت

مگر جب نفس جمعہ جو شرائط سے قطع نظر واجب اور شعائر اسلام سے ہے، اگر دیہات میں نمازِ ظہر پڑھنے کی وجہ سے جمعہ کی ادائیگی میں کاہلی اور سستی پیدا ہو اور کم فہم لوگ شرائط جمعہ ہی کو مقصود بنا کر جمعہ چھوڑنے کی جرأت کر بیٹھیں تو میری ناقص رائے میں مفتی وقت کو چاہئے کہ نماز ظہر پر پابندی لگا کر جمعہ کی تاکید کرے اور اس کو یہ حق ہے کہ ظہر پڑھنے سے لوگوں کو روک دے، تاکہ جمعہ کے لئے ذہن ہموار ہو سکے اور لوگ جمعہ کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔

مفتی کے لئے اختیار ترجیح

اولاً تو حدیث "اختلاف امتی و اصحابی رحمۃ" سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اختلافات جو امت کے لئے رحمت ہیں، یہ رحمت اسی وقت بن سکتے ہیں، جب کہ مفتی کو ان کے درمیان کسی ایک مسلک کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار ہو، ورنہ اختلافات کا غیر مختتم سلسلہ شروع ہو گا جو رحمت کے بجائے زحمت بن جائے گا۔

امام خاص کا انتخاب

ثانیاً خود خلیفہ کا عزل و نصب لوگوں کی رائے دہی پر موقوف ہے، تو جب خلافت کبریٰ کے انتخاب کا ان کو حق حاصل ہے تو جمعہ کے وعظ و خطبہ کے لئے امام مقرر کرنے کا

اختیار انہیں کیوں حاصل نہ ہوگا، کیونکہ امامت و وعظ دراصل امام عام کا منصب ہے، امامتِ صغریٰ اور وعظ و نصیحت کو امامتِ کبریٰ اور اولوالامر سے وہی نسبت ہے جو نورِ ضعیف کو نورِ قوی سے۔ خلافت کے باب میں اصول یہ ہے کہ امام المسلمین کی موجودگی میں کسی دوسرے کے ہاتھ پر بیعت کرنا جائز نہیں ہے، ورنہ یہ صریح بغاوت قرار دی جائے گی۔

جب حکومتِ اسلامیہ نہ ہو

غرض مسلمانوں کو امام خاص مقرر کرنے کا بدرجۂ اولیٰ حق حاصل ہے اور اسی سے یہ کام لینا چاہئے، مگر یہ امامتِ خاصہ، امامتِ عامہ (کبریٰ) کے مخالف نہیں ہے، کیونکہ یہ شرط اس وقت ہے، جب کہ امامتِ عامہ کا نام و نشان نہ رہے، تاکہ معنیٰ "جمع بین الخلیفتین" لازم نہ آئے، اس لئے "امامتِ کبریٰ" کی موجودگی کی صورت میں مندرجہ بالا حدیث اور آیتِ کریمہ: "اطیعوا الرسول واولی الامر منکم" کی رو سے یہ کام دراصل امامتِ عام ہی کا ہے۔ اگر لوگ امامِ عام کے رہتے ہوئے اپنے تئیں خود سے کسی کو امام بنا کر اس کا وعظ سننے اور اس کے احکام پر عمل کرنے لگیں تو گویا انہوں نے اسی کو اولوالامر قرار دیا، اور امامِ عام کے بالمقابل ایک دوسرے خلیفہ کا انتخاب کر لیا، جو بغاوت کے مترادف ہے۔ لیکن جب امامتِ عامہ کی مسند خالی ہو اور حکومت نہ ہو، اس وقت کسی دوسرے امام کا وعظ سنیں اور اس کو امام عام کے قائم مقام سمجھیں تو ممانعت کی کوئی وجہ نہیں اس گفتگو سے جمعہ کے لئے امیر کی شرط غیر لازم ہوگئی، اس وقت مصر کی شرط بھی خود بخود ختم ہو جائیگی کیونکہ مصر کی شرط امیر کی شرط ہی کی بناء پر تھی، البتہ روایات کے ظاہری الفاظ سے پتہ چلتا ہے کہ مصر کی ضرورت عام ہے (امیر ہو، یا نہ ہو) لہٰذا احتیاط یہی ہے کہ حتی المقدور مصر کی رعایت کو پیش نظر رکھیں، اور اگر کوئی کسی دیہات میں جمعہ قائم کرے، تو اس کے پیچھے نہ پڑیں۔ اس لئے کہ اولاً تو یہ شرط ظنی ہے، پھر گذشتہ گفتگو کی روشنی میں کمزور بھی ہے۔

ایک فکری کشمکش

البتہ یہاں ایک خلجان باقی رہ جاتا ہے، جس کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے، وہ یہ کہ جس طرح ظہر کی ادائیگی کم فہم لوگوں کے لئے جمعہ میں سستی و تہاون کا باعث بنتی ہے، اسی طرح امام خاص کے انتخاب کی اجازت اور اس کے مواعظ و نصائح کے سننے کا امامِ عام کے انتخاب کی تحریک کو کمزور کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ اگر جمعہ متروک ہو جائے تو اہلِ ہمت اور حوصلہ مند حضرات جمعہ کے شوق میں حالات کی روشنی اور وقت کے تقاضوں کے مطابق خلافتِ الٰہیہ کے لئے کچھ کام کر سکتے ہیں، ورنہ امامِ خاص ہی پر قناعت کر کے بیٹھ جائیں گے اس لئے میری رائے میں جمعہ اور ظہر میں سے کسی کا چھوڑنا اندیشہ سے خالی نہیں ہے۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ جمعہ اور ظہر دونوں کو جمع کر لیا جائے، یہی احتیاط کا تقاضا ہے۔

یہ خلاصہ ہے، جو میرے ذہن نارسا میں آئی، مگر میں نہ قاضی ہوں نہ فقیہ، نہ مفتی، نہ امام، کہ اجتہاد کروں اور لوگ میری بات مانیں، لہٰذا اگر دوسرے لوگ میرے ہم نوا ہوں تو فبہا، ورنہ "کالائے زبوں بریش خاوند" اس دفتر کو سر پر دے ماریئے اور جو کچھ وقت کے مناسب ہو اور علماء ربانی کے ارشادات کے موافق ہو، جو قرآن و حدیث کی اتباع سے دور نہ کرے اختیار کیجئے اور اس نیاز مند کو بھی مطلع کیجئے، تاکہ میں بھی جم غفیر کی پیروی کر سکوں اور تفرق کلمہ کے درپے نہ ہوں۔

مولانا رضوان احمد ندوی (فاضل دیوبند)
استاذ مدرسہ فیض الاسلام، پھلت، مظفر نگر

فقہی اختلافات کی بنیاد اور ان کا نقطۂ اعتدال

اسلام دین فطرت ہے اور پوری انسانی زندگی کے لئے ایک روشن ضابطۂ حیات ہے، قرآن حکیم نے جو منبع رشد و ہدایت ہے، اور اسلامی فقہ و قانون کا ماخذ اول ہے، انسانی زندگی کے لئے بنیادی زریں اصول کی نشاندہی کردی ہے، اس کے اجمالی احکام کی تشریح و توضیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ذریعہ ہو چکی ہے۔ ان دونوں یعنی کتاب و سنت کی روشنی میں متشابہ اور مماثل مسائل پر قیاس کرتے ہوئے یا علت و حکمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہائے کرام نے نئے ابھرنے والے مسائل کا حل تلاش کیا، تاکہ امت ضیق و تنگی میں مبتلا ہو کر قانونِ الٰہی سے بیزار ہو کر ناقابلِ برداشت تکلیف کے شکار نہ ہو جائیں، ان مسائل کی دریافت و استنباط میں فقہاء نے ملکی حالات اور مصالحِ مرسلہ کو بڑی حد تک معاون قرار دیا، نتیجۃً فقہی اختلاف وجود پذیر ہوئے، جن میں چار کو خاص شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، اسی وجہ کر یہ چاروں ائمہ اہل السنۃ و الجماعت کے نزدیک احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

علامہ احمد طحاویؒ فرماتے ہیں:

هٰذه الطائفة الناجية قد اجتمعت اليوم في مذاهب اربعة وهم الحنفيون، والمالكيون والشافعيون، والحنبليون رحمهم الله ومن كان خارجا عن هٰذه الاربعة في هٰذا الزمان فهو من اهل البدعة (الفصل الموهبي، ص ۲۳)

اہل سنت کا ناجی گروہ اس وقت چار مذہبوں میں مجتمع ہیں، حنفی، مالکی، شافعی، اور حنبلی، اللہ تعالےٰ ان مذاہب والوں پر رحمت فرمائے۔ اس زمانہ میں جو شخص ان چاروں مذہبوں سے باہر ہے، وہ بدعتی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں:

اعلم ان الأخذ بھذہ المذاہب الاربعۃ مصلحۃ عظیمۃ فی الاعراض عنھا کلھا مفسدۃ کبیرۃ۔ — مذاہب اربعہ کے اختیار کرنے میں عظیم فائدہ ہے اور ان کے ترک کر دینے میں بہت بڑا فساد ہے۔

(عقد الجید، ص: ۳۱)

اس سے ائمۂ اربعہ کی جلالت شان کا پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف وہ حق پر تھے، بلکہ ان کا پیرو ہونا اہلِ حق کی علامت قرار پایا۔ اسی لئے ان فقہائے عظام کی احادیث میں بڑی بشارت آئی ہے۔

حافظ ابو الفضل السیوطیؒ نے اپنی مشہور تصنیف "تبیض الصحیفہ" میں "بشارت المجتہدین" کے سلسلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کو یوں نقل کیا ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی بشارت میں فرمایا:

لوکان الایمان عند الثریا وفی روایۃ لوکان العلم معلقا بالثریا لنالہ رجال من أبناء فارس۔ — اگر ایمان ثریا کے پاس ہو، اور ایک روایت میں ہے کہ اگر علم ثریا پر ہو، تب بھی اسے فارسی نسل کے کچھ لوگ حاصل کرلیں گے۔

حضرت امام مالکؒ کا تعارف اور ان سے متعلق بشارتی کلمات ان الفاظ میں منقول ہیں:

یوشك ان یضرب الناس اکباد الابل یطلبون العلم فلا یجدون اعلم من عالم المدینۃ۔ — حصول علم کے لئے لوگ اپنی اونٹنیوں پر سوار ہوکر آئیں گے تو مدینہ کے عالم سے بڑھ کر کسی عالم کو نہ پائیں گے۔

حضرت امام شافعیؒ کے سلسلہ میں ارشاد گرامی ہے:

لا تسبوا قریشا فان عالمھا یملأ الأرض علماً — قریشی کو برا بھلا نہ کہو، اسلئے کہ اس کا عالم دنیا کو علم سے بھر دیگا

فقہی اختلافات کا نقطۂ آغاز

ان تمام فقہائے کرام کے درمیان جو فقہی نظریاتی اختلاف ہے اس کے چند بنیادی

اصول ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ فقہی اختلافات کا آغاز حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد پیدا ہوا، ان کی شہادت کے بعد ایک ایسا اقتدار اعلیٰ مسلمانوں پر مسلط ہو گیا جس نے اپنی سیاست کے ذریعہ عوام کو مرعوب تو ضرور کر لیا، لیکن شرعی معاملات میں مسلمانوں کو انکی رہنمائی پر کبھی اعتماد نہیں ہوا، دوسری طرف اسلامی حکومت کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا، عجمیوں کا عربیوں سے اختلاط ہونے لگا، چونکہ اشخاص طبیعت و رجحان میں مختلف ہوا کرتے ہیں جس سے اختلاف کا پیدا ہونا ناگزیر امر تھا، اس لئے اجتہاد و استنباط کی ضرورت پڑی اور اجمالی احکام کی تفصیل پر متوجہ ہونا پڑا، نتیجتاً دو مستقل فقہ کی بنیاد پڑ گئی، مدینہ کے لوگوں نے اپنے دیار کے علماء و فقہاء کو ترجیح دی اور کوفہ کے لوگوں نے اپنے دیار کے علماء و فقہاء کو زیادہ قابلِ اعتماد اور زیادہ قابلِ اتباع سمجھا، اس میں شہری اور علاقائی عصبیت کا رنگ چڑھ گیا، لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل گیا، بسا اوقات کسی خاص دیار کے لوگوں نے بعض حدیثوں کو اسی وجہ سے قبول نہیں کیا کہ وہ حدیثیں ان کے دیار کے علماء میں شہرت نہ پا سکی تھی (۱)۔ دوسری خرابی جو امت میں بہت سی فقہی خرابیوں کا سبب بنی وہ اجتہادی امور میں رواداری اور وسعتِ قلبی کے بجائے لوگوں کا بے جا تعصب اور تشدد رہا، اجتہاد خواہ کتنے ہی بڑے آدمی کا ہو غلطی اور صحت دونوں ہی باتوں کا احتمال رکھتا ہے۔

فقہی اختلافات کے بنیادی اسباب

اب ذرا ان اختلافات کی اصلیت پر غور کیجئے جو مختلف فقہاء کے درمیان پائے جاتے ہیں، ان کے چار بنیادی اسباب ہیں:

---

(۱) غالباً اس کی وجہ فقہی تعصب نہیں تھا، بلکہ یہ تھا کہ وضع حدیث کی کثرت کی وجہ سے سلف اس سلسلہ میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ دوسرے شہر کے علماء سے متعلق ان کی معلومات مشکوک ہوتی تھیں، اپنے شہر کے ثقہ و غیر ثقہ راویوں سے وہ بخوبی واقف ہوا کرتے تھے، اس لئے وہ انہیں کی روایت لینے میں زیادہ عافیت محسوس کرتے تھے، ہاں دوسرے اہلِ شہر کے معروف راویوں کی روایت لینے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

(رحمانی)

(۱) نص کے ثبوت اور عدم ثبوت میں اختلاف۔

(۲) نص کے افہام وتفہیم میں اختلاف۔

(۳) متعارض نصوص کے مابین جمع وتطبیق میں اختلاف۔

(۴) بنیادی قواعد واصول اور بعض مصادر میں اختلاف۔

سب سے پہلی چیز جو اختلاف کا سبب بنی وہ مسائل کے استنباط واستخراج اور حدیث کے سلسلۂ سند میں صحت وضعف کا پایا جانا ہے۔ مثلاً مرسل(۱) احادیث کی حجیت میں دو متضاد مکتب فکر پیدا ہو گئے کہ کیا وہ قابلِ اعتبار ہے، یا نہیں۔ دوسرا بنیادی اختلاف یہ ہے کہ عربی زبان میں بعض ایسے الفاظ ہیں جو اپنے معنیٰ ومفہوم میں بالکل واضح ہیں، لیکن اس لفظ میں کئی معنوں کا احتمال باقی رہتا ہے، مثلاً لفظ "عین" عربی زبان میں مشترک ہے، جو متعدد معنیٰ کے لئے وضع کیا گیا ہے، اس کا صحیح علم جملوں کے سیاق و سباق سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے "رایت عینًا" اس سے مراد جاری پانی، انسان کی آنکھ، جاسوس بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح لفظ "قروء" میں دو معنیٰ کا احتمال ہے، اس سے حیض اور طہر دونوں مراد لئے جا سکتے ہیں۔ تیسری شکل یہ ہے کہ نص میں بظاہر تعارض پیدا ہو جائے تو فقہاء اجتہاد کے ذریعہ ترجیح وتطبیق کی شکل نکالتے ہیں، اگر دونوں کا جمع کرنا ممکن نہ ہو تو نسخ کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، ایک کو ناسخ دوسرے کو قرائن کے ذریعہ منسوخ مانتے ہیں، ناسخ پر عمل کیا جاتا ہے، منسوخ کو ابتدائی دور کا عبوری حکم تصور کیا جاتا ہے۔ مثلاً "افطر الحاجم والمحجوم" یعنی روزے کی حالت میں سنگھی لگانے اور لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی کے متعارض دوسری حدیث ہے "احتجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہو محرم صائم" کہ روزے کی حالت میں آپ نے پچھنا لگوایا۔ دونوں حدیث صحیح سند سے مروی ہے۔ لیکن پہلی حدیث منسوخ اور دوسری ناسخ ہے۔ کیونکہ

---

(۱) یعنی وہ حدیثیں جس کو تابعی براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کردے اور درمیان کے واسطہ کا ذکر نہ کرے۔ مرسل کی اسی صورت کی بابت فقہاء ومحدثین کے درمیان اختلاف ہے۔ رحمانی

آپ کا احرام کی حالت میں پچھنا لگوانا حجۃ الوداع کے موقع پر تھا، اختلاف کی چوتھی شکل اصول وقواعد میں اختلاف ہے، جو فرض، واجب، سنت اور مستحب کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ یہ اختلاف صرف فروعی مسائل کے اندر ہے، جو امت کے لئے ایک بڑی نعمت ہے، گذشتہ امتوں کے اختلافات عذاب وہلاک کا ذریعہ تھا، اس امت پر خدا کا فضل واحسان ہے کہ اس پر آسانی وسہولت پیدا کرنے کے لئے توسع اور گنجائش کی شکل نکالی گئی ہے، گذشتہ انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک شریعت اور ایک حکم دے کر مبعوث کئے جاتے تھے، جس کی وجہ سے ان کی شریعتوں میں حرج وتنگی پیدا ہو جاتی تھی، ان میں اختیار وا باحت کی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ مثلاً یہود کی شریعت میں قصاص، نصاریٰ کی شریعت میں دیت ہی کا لزوم ہوتا تھا، گذشتہ انبیاء علیہ السلام صرف ایک حکم دے کر مبعوث کئے گئے تھے، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک حکم میں مختلف احکام دے کر بھیجا، اسی وجہ سے علامہ سبکیؒ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا "بعثت الی الناس کافۃ" کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ آپ کی بعثت تمام مخلوق پر تھی، جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک مشتمل رہے گی۔

فقہ حنفی وشافعی کی بعض امتیازی خصوصیات

فقہائے کرام نے اپنی فقہ کی بنیاد کتاب وسنت اور صحابہ کرامؓ کے اقوال وافعال وفتاویٰ پر رکھی، چونکہ اشخاص طبیعت ورجحان میں مختلف ہوا کرتے ہیں، جس سے اختلاف کا پیدا ہونا ناگزیر ہے اس لئے تمام فقہاء کرام مسائل کے استنباط واستخراج میں دوسرے فقہاء سے اپنی نوعیت میں منفرد ہیں۔

امام شافعیؒ کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حنفی ومالکی اکاڈمی میں روایات کے جمع وتطبیق کے لئے کوئی منضبط اصول وقواعد نہ تھے، جس کی وجہ سے مسائل کے استنباط میں بسا اوقات خلل واقع ہوتا تھا، امام شافعیؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس راہ کو بند کیا اور اصول فقہ میں ایک جامع کتاب لکھی۔

۲۔ مرسل و منقطع[۱] روایات کو آزادیٔ رائے سے لینے کا دروازہ بند کر کے امام موصوف نے ان روایات کے قبول کرنے کے لئے کچھ شرطیں مقرر کیں۔

۳۔ چند علتوں کی بنیاد پر حضرت امام شافعیؒ نے استحسان کی شدت سے مخالفت کی، اور فرمایا کہ "من استحسن فقد شرع" (جو شخص اس طرح کا استحسان کرتا ہے، وہ درحقیقت مستقل شارع بننا چاہتا ہے) استحسان کی مخالفت کر کے امام شافعیؒ نے اسلامی قانون کی اصل روح کی حفاظت کرنے کی کوشش کی[۲]۔ اسلامی قانون کی اصل روح یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کی تصریحات پر مبنی ہو اور اگر کسی امر میں ان دونوں ماخذ کے اندر کوئی تصریح موجود نہ ہو تو یہ ضروری ہے کہ اس مسئلہ کا حل قیاس شرعی کے مطابق نکالا جائے محض اپنے ذوق و رجحان طبع کو دخل انداز نہ ہونے دیا جائے۔

فقہ حنفی کے اصول اور بعض امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ فقہ حنفی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اکثر اور کم و بیش نوے فیصدی مسائل مصالح انسانی پر مبنی ہیں، البتہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جس کی مصلحت عام لوگ نہیں سمجھ سکتے، لیکن درحقیقت وہ مصلحت سے خالی نہیں۔

۲۔ جو احکام نصوص سے ماخوذ ہیں اور جن میں ائمہ کا اختلاف ہے، ان میں امام ابو حنیفہؒ جو پہلو اختیار کرتے ہیں وہ عموماً نہایت قوی اور مدلل ہوتا ہے۔

۳۔ ابن عبد البر نے "انتقاء" میں امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

"جب کوئی مسئلہ نہ کتاب اللہ میں ملے، نہ سنت رسولؐ میں تو میں اقوالِ صحابہؓ پر غور کرتا ہوں اور اقوالِ صحابہؓ کے سامنے کسی کے قول کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتا"۔

۴۔ فقہ حنفی دوسرے مکاتب فکر کی بہ نسبت آسان اور سہل العمل ہے۔ کیونکہ یہ تمدن

---

(۱) جس کی سند میں کہیں اتصال ٹوٹ جائے، اور راوی نے روایت کرنے میں درمیانی واسطہ کو حذف کر دیا ہو (ادارہ) (۲) یہی استحسان جو امام شافعیؒ کے یہاں ایک نئی شریعت وضع کرنے کے مرادف ہے، امام مالکؒ کے بقول علم کے ۱۰ حصوں میں سے ۹/ حصہ ہے، اور امام ابو حنیفہؒ کے یہاں اس کی یہ اہمیت ہے کہ جب امام صاحب استحسان کرتے تو تلامذہ کو اختلاف کی جرأت نہ ہوتی۔ دراصل یہ ائمہ جس استحسان کے قائل ہیں، اس کو خود امام شافعیؒ بھی "قیاس" کے ذیل میں صحیح سمجھتے ہیں۔ انہوں نے استحسان سے جو مراد لیا ہے اس سے مختلف ہے، جو حنفیہ اور مالکیہ کہتے ہیں۔ "رحمانی"

کے تقاضوں کے مطابق ہے۔

۵۔ فقہائے احناف کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن خلدون لکھتے ہیں:

"بہرحال ماننا پڑتا ہے کہ فقہائے احناف کو اس میں بے نظیر مہارت ہے کہ نکات فقہ کی گہرائیوں تک خوب پہونچتے ہیں اور مسائل فقہ سے اصولِ فقہ کے قواعد خوب نکالتے ہیں۔"

۶۔ فقہ حنفی کی عصر حاضر میں مقبولیت سے متعلق ڈاکٹر صبحی محمصانی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"جو ملک سلطنت عثمانیہ کے زیر حکومت رہے، ان کا مذہب بھی محکمہ عدلیہ حنفی تھا۔"

بلاد اسلامیہ میں فقہی رجحانات کے اثرات

حضرت امام ابو حنیفہؒ کے عہد تک یہ ضرور رہا ہے کہ فقہ کے معتدبہ مسائل کا ذخیرہ اکٹھا ہو چکا تھا، بہت کچھ خلفائے راشدین کے عہد میں ہوا اور اس کے بعد ضروریات اور وسعتِ تمدن کی بناء پر مسائل برابر بڑھتے رہے اور فقہ کی صورت اختیار کرتے رہے لیکن یہ جو کچھ تھا غیر مرتب، پریشان اور غیر مدون صورت میں تھا، فن کی حیثیت سے کچھ بھی موجود نہ تھا، محض جزئیات مسائل کا نام فقہ تھا، امام ابو حنیفہؒ اولین شخص ہیں جنہوں نے علم شریعت کو مدون کیا، لیکن تاریخ سے اس بات کا پتہ لگانا کہ امام اعظمؒ کو خاص کس وجہ سے فقہ کی تدوین کا خیال پیدا ہوا، سیرۃ النعمان کے مصنف نے اس سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دو شخص حمام میں نہانے گئے اور حمامی کے پاس امانت رکھتے گئے، ایک ان میں سے نہا کر نکلا اور حمامی سے امانت طلب کی، اس نے دیدی، یہ لیکر چلتا ہوا، دوسرا حمام سے باہر آیا اور امانت مانگی تو اس نے عذر کیا کہ میں نے تمہارے شریک کے حوالے کر دی، اس نے عدالت میں استغاثہ کیا، قاضی نے حمامی کو ملزم ٹھہرایا کہ جب دونوں نے مل کر

تیرے پاس امانت رکھی تھی تو تجھ کو ضروری تھا کہ دونوں کی موجودگی میں واپس کرتا۔ حمامی گھبرایا ہوا امام ابو حنیفہؒ کے پاس آیا۔ امام صاحبؒ نے کہا کہ تم جاکر اس شخص سے کہو کہ تمہاری امانت ادا کرنے کے لئے تیار ہوں، لیکن قاعدے کے موافق تنہا تم کو نہیں دے سکتا شریک کو تو لے آؤ۔"

کہا جاتا ہے کہ یہی واقعہ تدوینِ فقہ کا محرک بنا اور اس کی ترتیب و تزئین میں ہمہ تن مصروف ہو گئے اور باقاعدہ چالیس باکمال اور ممتاز اشخاص کی ایک تحقیقاتی اکاڈمی قائم کی جہاں نہایت آزادی کے ساتھ بحث و مباحثہ شروع ہوتا اور اخیر میں) امام صاحب خوب غور و تحمل کے بعد جچا تلا فیصلہ کرتے تھے کہ سب کو تسلیم کرنا پڑتا، اس قانونی مدرسہ میں جس قدر مسائل مدون ہوئے ان کی تعداد بارہ لاکھ نوے ہزار سے کچھ زائد ہے، جو انسانی ضرورتوں کے لئے نہایت مناسب اور موزوں واقع ہوئی، یہی وجہ ہے کہ آپ کی فقہ نے ان ممالک و بلادِ عربیہ میں زیادہ اور ہمہ گیر مقبولیت حاصل کی جو تہذیب و تمدن کے مراکز سمجھے جاتے تھے، امام ابو یوسفؒ نے جب عباسی سلطنت میں وزیر قانون کا عہدہ سنبھالا تو فقہ کے پھیلاؤ کے لئے ایک مادی محرک بھی پیدا ہو گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وکان اشهر اصحابه ذکرا ابو یوسف تولی قضاء القضاة ایام هارون الرشید فکان سببا لظهور مذهبه والقضاء به فی اقطار العراق وخراسان وما وراء النهر۔

(حجۃ اللہ البالغہ، ص: ۳۴۴)

امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں میں سب سے مشہور امام ابو یوسفؒ ہیں، وہ ہارون الرشید کے عہد میں قاضی القضاۃ مقرر کئے گئے، پس وہ امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی شہرت کا اور اطراف عراق، خراسان اور ماوراء النہر میں معمول بہ ہونے کا سبب بن گئے۔

ایشیا میں عنانِ حکومت جن لوگوں کے ہاتھوں میں رہی وہ قریب قریب سب کے سب حنفی تھے، یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے مقلدین آج بھی عراق، ہند، چین، ماوراء النہر، اور بلادِ عجم میں بکثرت پھیلے ہوئے ہیں، خاص کر خلافتِ عباسیہ میں بڑا رواج ہوا اور علمی مباحث پر تصنیف و تالیف کا موقع ملا، اس زمانہ میں دنیا کا سب سے بڑا قانون اور سب سے

وسیع و مقبول فقہ آپ ہی کی تھی، آپ کی فقہ میں عبادات کے علاوہ، دیوانی، فوجداری، تعزیرات لگان و شہادت، وراثت و ترکہ اور بکثرت دیگر قوانین شامل تھے، جس فقہ پر ہارون الرشید کی وہ سلطنت قائم تھی، وہ فقہ، فقہ حنفی ہی تھا، خلافتِ عباسیہ کے تنزل کے بعد جن خاندانوں کو عروج ہوا وہ اکثر حنفی تھے۔ خاندان سلجوقی، خاندانِ غزنوی، خاندانِ غوری وغیرہ سب حنفی تھے۔

امام مالکؒ کا مذہب مغرب اور اندلس میں پھیلا، یہ لوگ بدوی تھے، یہاں کے لوگوں نے وہ ترقی حاصل نہیں کی، جو اہلِ عراق نے کی، البتہ مدینہ منورہ دارالعلوم بنا ہوا تھا، یہیں سے سب جگہ علم کی آبیاری ہوتی تھی، اسلئے انہوں نے جو کچھ علم و معرفت کی خوشہ چینی کی وہ حجاز ہی سے کی، عراق سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔

امام شافعیؒ کے مقلدین مصر میں زیادہ تر ملتے ہیں، ابتداء عراق و خراسان اور ماوراء النہر کے بعض علاقوں میں بھی ان کے مقلدین پائے جاتے تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے مقلدین بہت کم تعداد میں ہیں، کیونکہ ان کا مذہب اجتہاد سے دور ہے، انہوں نے زیادہ تر اعتماد اخبار و روایات پر کیا ہے، جو ایک دوسرے کی تائید کرتی ہے۔ بہرحال حنبلی مذہب کے پیرو شام، عراق اور بغداد کے گرد و نواح میں ملتے ہیں۔

فقہائے امت کا یہ اختلاف صرف دین میں تفقہ اور کتاب و سنت سے شرعی مسائل و احکام کو مستنبط کرنے کا نتیجہ ہے، ان میں کوئی بنیادی اور اصولی اختلاف نہیں ہے، جو کچھ اختلاف ہے، یا تو تاویل و اجتہاد کا معمولی اختلاف ہے، جس کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں۔ یا پھر یہ کہ ہر مذہب کے متاخرین کے غلو اور تعصب کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے تاویل و اجتہاد کے اختلاف کو عقیدہ اور اصول کا اختلاف بنا رکھا ہے۔ ہماری اسلامی فقہ کے مختلف اسکولوں میں ایک دوسرے کے خلاف بالکل اس طرح تعصبات پیدا ہو گئے ہیں، جس طرح کے تعصبات دو مختلف العقیدہ فرقوں کے اندر پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ تعصب اور تشدد کا اصل سبب درحقیقت جہالت، قصورِ علم اور قلتِ فکر ہے، کیونکہ

اختلاف کا تعلق اصول و مبادی سے نہیں ہے، بلکہ اقامتِ دین اور جزوی احکام کے ثبوت میں ہے، تاکہ امت تنگی و حرج میں مبتلا ہو کر جمود و تعطل کی شکار نہ ہو جائے، اس لئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: "یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" اللہ تعالیٰ تم سے آسانی چاہتا ہے، نہ کہ تنگی و حرج۔

ماخذ و مراجع

حجۃ اللہ البالغہ۔
فقہی اختلافات کا حل۔
الفصل الوھبی۔
اصلی حنفیت۔
عقد الجید۔
اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ۔
الانتقار۔
کشف الظنون۔
الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف۔
اختلاف الائمۃ الاربعہ۔
دراسات فی الاختلافات الفقہیہ۔
فقہ الائمہ۔

مولانا سید حسنین احمد ندوی (ابوظہبی)

اسلام میں سرمایہ کاری کے اصول

(۱) مضاربت

سرمایہ کاری یا مشترکہ کاروبار انسانی دنیا کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، اسلئے کہ معاشرہ میں ہر طرح کے افراد ہوتے ہیں، امیر غریب، جوان، بوڑھے، بچے، عورتیں۔ کسی کے پاس سرمایہ ہوتا ہے، لیکن تجارتی اور کاروباری صلاحیتیں نہیں ہوتیں، جب کہ کسی کے پاس ایسی صلاحیتیں ہوتی ہیں، لیکن سرمایہ نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ایسی بڑی صنعتوں کا قیام جس کے لئے کروڑوں اور اربوں روپے کے سرمایہ کی ضرورت ہو تنہا کوئی مالدار شخص بھی اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سترہویں صدی سے صنعتی انقلاب کے آغاز کے ساتھ ہی مشترکہ کاروبار کا رواج بڑھا اور بلاشبہ آج کی عظیم صنعتی اور کاروباری ترقی اسی کی مرہون منت ہے۔

گذشتہ تین سو سال کے وسیع تجربات کسی بھی فریق کو استحصال سے بچانے کے لئے حکومت کی جانب سے عائد کردہ پابندیاں اور اصول وضابطے میں ترمیم واصلاح کے نتیجہ میں اب سرمایہ کاری کا مروجہ نظام انتہائی منظم اور ترقی یافتہ بن چکا ہے، جس کا مقصد ملک کی تعمیر وترقی میں اہم رول اداکرنے کے علاوہ اس کے فوائد عام لوگوں تک پہنچانا ہے۔

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ مروجہ سرمایہ کاری کے نظام نے اپنے مقاصد میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے، چنانچہ سرمایہ دار طبقہ کے علاوہ ملک کے مزدور، کسان، ملازم پیشہ اور عام افراد بھی صنعتی اور کاروباری ترقیوں کے ثمرات سے حسب مقدور فائدہ اٹھارہے ہیں، لیکن اس نظام کی ایک اہم خامی جس نے اس کی افادیت کو متاثر کرنے کے علاوہ اسے مسلمانوں کے لئے شجر ممنوعہ بنا دیا ہے، اس میں سود کی شمولیت ہے۔

اسے عالم انسانیت کی بدنصیبی کہئے کہ عصر جدید کا آغاز جہاں سے مادی کامیابی و

کامرانی کی نئی تاریخ شروع ہوتی ہے، اس وقت ہوا جب کہ مسلمانوں کی آٹھ صدیوں سے زیادہ پر پھیلی ہوئی عالمی قیادت کی بساط سمٹ رہی تھی، دنیا کی دیگر قومیں علم و فن اور تحقیقات و تجربات کی انجمن آرائی کے لئے بھاگ دوڑ کر رہی تھیں، مسلمان شاندار ماضی کی یاد کا تکیہ لگا کر استراحت کی تیاری میں مصروف تھے۔ اس افسوسناک حقیقت کا نتیجہ بہت جلد سامنے آگیا اور مسلمان عصر جدید میں نہ صرف بنیادی رول ادا نہ کر سکے، بلکہ وہ اس پر اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں بھی نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں نشو و نما پانے والی اکثر چیزیں کسی نہ کسی درجہ میں اسلامی نظام حیات سے متصادم نظر آتی ہیں۔

دیگر علوم و فنون کی طرح سرمایہ کاری میں بھی نئے نئے تجربات ان اقوام کے ذریعہ کئے گئے، جو نہ صرف اسلامی تصور حیات سے بے گانہ تھے، بلکہ وہ ایسے انسانی اقدار و روایات کو بھی اہمیت دینے کے لئے تیار نہ تھے، جو ان کے معاشی استحصال اور مادی لوٹ کھسوٹ کے راستہ میں رکاوٹ بنے۔ اس سلسلہ میں عالمی سطح پر یہودی ساہوکاروں کا گروہ سب سے زیادہ سرگرم رہا ہے۔ اگرچہ اب دنیا کے بیشتر ممالک میں سرمایہ کاری کے لئے مستقل قوانین بن گئے ہیں اور ان خامیوں کی کسی حد تک اصلاح بھی کر لی گئی ہے، جن سے معاشی لوٹ اور استحصال کے راستے کھلتے تھے، لیکن سب سے بڑی خامی اس نظام کی سودی بنیاد ہے وہ بدستور موجود ہے اور اس کی جڑیں عالمی سطح پر اتنی گہری ہیں کہ اس سے پیچھا چھڑانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

سرمایہ کاری کی بنیادیں سود پر استوار کرنے کی وجہ سے ملکی اور قومی سطح پر جو نقصان پہونچ رہا ہے اس کا احساس اب لوگوں میں بڑھتا جا رہا ہے، کئی مشہور ماہرِ معاشیات نے اس کے خلاف بہت کچھ لکھا بھی ہے اور بعض ممالک سے اس کے خلاف آوازیں بھی اٹھ رہی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ عالمی سطح پر سرمایہ کاری کا نظام اس طرح سود کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے کہ اس سے کسی بھی ملک یا قوم کا پیچھا چھڑانا انتہائی دشوار اور مشکل ترین امر ہے، اس کے لئے طویل اور صبر آزما جد و جہد کی ضرورت ہے، جس کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ اسلام کے سرمایہ کاری کے نظام کو جو انتہائی مرتب اور مربوط شکل میں فقہ کی کتابوں

میں موجود ہے، عہد جدید کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے از سر نو مرتب کیا جائے اور پھر اسے بتدریج فروغ دیا جائے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے سرمایہ کاری کی بنیاد چار چیزوں پر رکھی جا سکتی ہے، مضاربت، شرکت، اجارہ اور مرابحہ۔

مضاربت

لفظ "مضاربۃ" الضرب فی الارض سے ماخوذ ہے، جس کے معنیٰ ہیں سفر کرنا اس عقد کو مضاربت کا نام اس لئے دیا گیا کہ مضارب بھی تجارت کے سلسلہ میں سفر کرتا ہے اور اس طرح اللہ کے فضل کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے[1]۔ مضاربت کے علاوہ اس عقد کو "مقارضہ" یا "قرض" بھی کہا جاتا ہے، جو قرض سے مشتق ہے، اس کے معنیٰ ہیں کاٹنا۔ چونکہ اس معاملہ میں سرمایہ کار اپنے سرمایہ کے ایک حصہ کو الگ کر کے "مضارب" کو دے دیتا ہے، اس مناسبت سے اس کو "مقارضہ" یا "قراض" بھی کہا جاتا ہے[2]۔

اسلام سے قبل دور جاہلیت میں بھی یہ شکل موجود تھی، خصوصاً قریش مکہ میں اس کا عام رواج تھا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منصب نبوت پر فائز ہونے سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا سرمایہ لے کر تجارتی سفر کیا ہے، جس کی نوعیت قریب قریب یہی تھی[3]۔

مضاربت کی اس غیر معمولی افادیت کی وجہ سے اسلام نے اس کو باقی رکھا، اس کے جواز پر فقہاء کا اتفاق ہے اور اس پر قرآن و حدیث، اجماع اور قیاس چاروں ہی مآخذ شاہد ہیں۔

---

(۱) سبل السلام۔ ۳/۷۵۔

(۲) المغنی۔ ۵/۲۲۔

(۳) المحلی بالآثار۔ ۷/۹۶۔

قرآن پاک نے تو اس کا ذکر ابہام کے ساتھ کیا ہے، لیکن حدیث میں صراحت ہے کہ تین چیزوں میں برکت ہے، اور آپؐ نے ان تین میں ایک مضاربت کو قرار دیا ہے[1]۔ حضرت عباسؓ بعض شرطوں کے ساتھ مضاربت کے لئے سرمایہ دیتے تھے، جن کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاع کے باوجود باوجود باقی رکھا اور کوئی نکیر نہیں فرمائی[2]۔ حضرت عمر، عثمان، علی، ابن مسعود، عبداللہ بن عمر، حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہم) سے یتیموں کے مال کو مضاربت پر لگانا ثابت ہے اور صحابہؓ نے اس پر کوئی اشکال بھی نہیں فرمایا تو گویا "مضاربت" پر صحابہؓ کا اجماع واتفاق منعقد ہو چکا ہے[3]۔ یہی تقاضائے قیاس بھی ہے کہ اس میں سرمایہ کار کے لئے بھی آسانی ہے اور مضاربت کے لئے بھی، دونوں کی ضرورت اس طریقہ سے پوری ہوتی ہے[4]۔

بنیادی اصطلاحات

مالک سرمایہ عامل کو اپنا مال اس غرض سے دے کہ وہ اس میں تجارت کرے، اور نفع طے شدہ تناسب کے مطابق تقسیم ہو جائے۔ یہ "مضاربت" ہے[5]۔ عقد مضاربت میں بنیادی طور پر دو فریق ہوں گے، ایک تو وہ جو اپنا سرمایہ لگائے گا، فقہی اصطلاح میں اسے "رب المال" یعنی سرمایہ کار کہتے ہیں۔ دوسرا وہ شخص جسے کاروبار کے لئے رقم دی جائے گی اسے "مضارب" کہتے ہیں، اور لگائے جانے والے سرمایہ کو "راس المال" کہتے ہیں۔

بنیادی ارکان

عقد مضاربت کے تحت جہاں ایک شخص اپنا سرمایہ لگا سکتا ہے وہیں چند

---

(۱) ابن ماجہ۔ ۲/۲۳۔

(۲) بیہقی۔ ۶/۱۱۱۔

(۳) بدائع الصنائع۔ ۶/۹۷۔

(۴) المبسوط۔ ۲۲/۱۸

(۵) رد المختار۔ ۴/۵۰۴۔

افراد مل کر، یا کوئی کمپنی اور بینک بھی سرمایہ کاری کرسکتا ہے۔ اسی طرح مضارب جہاں فرد واحد ہوسکتا ہے، وہیں چند افراد کوئی کمپنی یا بینک بھی ہوسکتا ہے۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لڑکے عبداللہؓ اور عبیداللہؓ نے بیت المال کے سرمایہ سے مضاربت کی بنیاد پر کاروبار کیا، جس میں کہ نصف منافع بیت المال میں جمع کیا گیا اور نصف ان دونوں کو ملا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوئی نکیر نہیں فرمائی۔[1]

مضاربت کا انعقاد اس طرح عمل میں آئے گا کہ سرمایہ کار اپنا سرمایہ مضارب کے سپرد کردے اور کہے کہ اس سے تم کاروبار کرو، جو منافع ہوگا وہ نصف، ثلث، ربع یا کسی اور متعینہ نسبت سے آپس میں تقسیم کرلیں گے۔ اور مضارب اس پر آمادہ ہوجائے اس طرح مضاربت کا انعقاد عمل میں آجائے گا اور منافع اس شرح کے مطابق فریقین کے درمیان تقسیم ہوگا، جو انہوں نے آپس میں طے کیا ہے۔

مضاربت کے صحیح ہونے کی شرطیں

مضاربت کے صحیح ہونے کے لئے حسب ذیل سات شرطیں ہیں:

(۱) فریقین میں وکیل بننے کی صلاحیت ہو

فریقین یعنی مضارب اور سرمایہ کار دونوں میں وکیل بننے کی صلاحیت کا پایا جانا ضروری ہے، اس لئے کہ مضارب سرمایہ کار کے حکم سے مال میں تصرف کرتا ہے۔ لہٰذا اس کی حیثیت وکیل کی ہوجاتی ہے اور سرمایہ کار چونکہ مضارب کو وکیل بناتا ہے، اسلئے اس میں بھی وکیل بنانے کی صلاحیت کا پایا جانا اس لئے ضروری ہے کہ جو شخص خود وکیل بننے کی اہلیت نہیں رکھتا وہ دوسرے کو بھی وکیل نہیں بنا سکتا۔[2]

---

(۱) الفقہ الاسلامی وادلتہ۔

(۲) الفقہ الاسلامی وادلتہ۔ ۴/۸۴۳ـ
۱۵۵

وکالت کے صحیح ہونے کے لئے حسب ذیل شرائط ہیں :

۱۔ مؤکل جس چیز کے سلسلہ میں کسی کو وکیل بنا رہا ہے وہ خود اس میں تصرف کا مالک ہو اور اس کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔

۲۔ وکیل یعنی جس کے سپرد ذمہ داری کی جارہی ہے، اس میں تصرف کی صلاحیت ہو، یعنی وہ پاگل یا خفیف العقل وغیرہ نہ ہو۔

۳۔ جس چیز کے سلسلہ میں کسی کو وکیل بنایا گیا ہے، اس سے وہ واقف ہو۔

۴۔ جس چیز کے سلسلہ میں وکیل بنایا گیا ہے، اس میں تصرف شرعاً جائز ہو۔

۵۔ کام کا تعلق ایسی چیز سے ہو جس میں نیابت صحیح ہو۔ مثلاً خرید و فروخت وغیرہ۔

مضاربت کے کاروبار میں فریقین کا مسلمان ہونا ضروری نہیں، بلکہ کسی کے ساتھ بھی یہ معاملہ جائز ہوگا۔ اسی طرح اس کاروبار کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ملک کے اندر ہی ہو۔ بلکہ بین الاقوامی سطح پر دیگر ممالک کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

(۲) سرمایہ نقد ہو

سرمایہ کے لئے نقد رقم کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی وہ سکہ جو ملک میں رائج ہو، بینک کے چیک یا ڈرافٹ کا شمار بھی نقد رقم میں کیا جائے گا، لہٰذا سامان یا جائیداد، منقولہ ہو یا غیر منقولہ مضاربت میں اسے سرمایہ بنانا صحیح نہیں ہوگا، اسلئے کہ مضاربت میں سرمایہ کا متعین ہونا ضروری ہے، سامان کی قیمتیں مارکٹ میں مختلف ہوتی ہیں اور پھر ان میں اتار چڑھاؤ بھی ہوتا رہتا ہے، اس وجہ سے سامان کی صورت میں سرمایہ کی تعیین مشکل ہے۔ لہٰذا اسے سرمایہ بنانا صحیح نہیں ہوگا۔ البتہ اگر ایسی صورت ہو کہ سرمایہ کار مضارب کے سپرد کوئی سامان کرے اور کہے کہ اسے فروخت کرکے جتنی رقم حاصل ہو اس سے مضاربت کی بنیاد پر کاروبار کرو تو یہ صورت صحیح ہوگی، اس لئے کہ اس صورت میں مضاربت کے لئے سرمایہ سامان نہیں، بلکہ اس کی قیمت بن رہی ہے[1]۔

(۱) الاشباہ والنظائر۔ ص: ۵۰۳۔

سونا چاندی جو اصل کے اعتبار سے ثمن ہے، لیکن معاملات میں چونکہ اب کسی بھی ملک میں اس کا استعمال نقد کی حیثیت سے نہیں ہوتا، اس لئے اس کا شمار بھی سامان میں ہوگا اور اسے مضاربت میں سرمایہ بنانا صحیح نہیں ہوگا۔[1]

(۳) سرمایہ کی مقدار سے فریقین کی واقفیت

مضاربت میں سرمایہ کی تعیین ضروری ہے، فریقین اس بات سے واقف ہوں کہ سرمایہ کی مقدار اتنے سو، ہزار یا لاکھ ہے، اس لئے کہ سرمایہ کے متعین نہ ہونے کی صورت میں اس سے حاصل ہونے والے منافع کا تناسب متعین کرنا مشکل ہو جائیگا، جبکہ مضاربت میں منافع کا متعین ہونا ضروری ہے۔

(۴) سرمایہ موجود ہو

مضاربت میں سرمایہ کا موجود ہونا ضروری ہے۔ موجود ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ قرض کی شکل میں نہ ہو، لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے مقروض سے کہے کہ تمہارے ذمہ جو میرا قرض ہے اس سے بطور مضاربت ان شرائط پر کاروبار کرو تو یہ صحیح نہیں ہوگا، اسلئے کہ اس صورت میں سرمایہ قرض کو بنایا جا رہا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ البتہ اگر قرض کسی دوسرے شخص پر ہو اور سرمایہ دار کہے کہ میرا قرض اس سے وصول کر لو اور پھر اس سے بطورِ مضاربت ان ان شرائط پر کاروبار کرو تو یہ صورت صحیح ہوگی، اسلئے کہ اس صورت میں سرمایہ قرض نہیں بن رہا ہے، بلکہ وصول کے بعد نقد رقم سرمایہ بن رہا ہے۔

اسی طرح بطور ودیعت (امانت) اگر کسی کو مال دیا گیا اور پھر اس سے صاحبِ مال نے کہا کہ میرا جو مال بطورِ ودیعت (امانت) تمہارے پاس ہے، اس سے مضاربت کے طور پر ان شرائط پر کاروبار کرو تو یہ صورت صحیح ہوگی، اسلئے کہ بطور ودیعت

---

(۱) بدایۃ المجتہد - ۲/۲۳۷ - بدائع الصنائع - ۶/۸۲ -

(۲) بدائع الصنائع - ۶/۸۲ -

کسی کو مال دے دینے سے اصل مالک کی ملکیت اس سے ختم نہیں ہوتی، بلکہ اس کا اختیار اس پر بدستور باقی رہتا ہے، لہٰذا اسے مضاربت کے طور پر دینا صحیح ہے۔

غصب کئے ہوئے مال کو بھی مضاربت میں سرمایہ بنانا صحیح ہوگا، اس لئے کہ غصب شدہ مال پر سے اصل مالک کی ملکیت ختم نہیں ہوتی، بلکہ بدستور باقی رہتی ہے۔ اس لئے غصب شدہ مال کا مالک اگر غاصب سے کہے کہ غصب شدہ مال سے ان ان شرائط پر بطور مضاربت کاروبار کرو تو یہ صورت بھی صحیح ہوگی[1]۔

(۵) سرمایہ مضارب کے حوالے ہو

فریقین کے درمیان عقد مضاربت کے طے ہوتے ہی سرمایہ مکمل طور پر مضارب کے حوالے کرنا ضروری ہوگا، اس لئے کہ مضاربت میں ایک شخص کا مال ہوتا ہے اور دوسرے شخص کی محنت اور یہ محنت اسی وقت اچھی طرح بار آور ہوسکتی ہے جب کہ سرمایہ پر محنت کرنے والے کا مکمل کنٹرول ہو اور وہ اس میں حسبِ منشاء تصرف کرسکے، اس کے علاوہ مضاربت میں سرمایہ مضارب کے پاس امانت ہوتا ہے، لہٰذا اس اعتبار سے بھی سرمایہ کی مکمل حوالگی ضروری ہے، اسلئے کسی بھی ایسی صورت کا پایا جانا جس میں کہ سرمایہ پر مضارب کا مکمل کنٹرول نہ ہو، مضاربت صحیح نہیں ہوگی، مثلاً سرمایہ کار یہ شرط لگادے کہ وہ بھی مضارب کے ساتھ کام کرے گا تو مضاربت صحیح نہیں ہوگی، اس لئے کہ اس صورت میں سرمایہ میں اس کا بھی تصرف ہوگا جس کے نتیجہ میں سرمایہ پر مضارب کا مکمل کنٹرول نہ ہوگا البتہ اگر ایسی صورت ہو کہ سرمایہ کار مضارب کا اپنی طرف سے کچھ تعاون کردے، مثلاً تجارتی گر بتلائے، یا اپنے اثر ورسوخ کے ذریعہ مارکٹ میں مضارب کا قدم جمائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے[2]۔

---

(۱) بدائع الصنائع۔ ۶/۸۳۔

(۲) الفقہ الاسلامی وادلتہ۔ ۴/۸۴۶۔

(۶) منافع میں فریقین کی شرکت

مضاربت کے صحیح ہونے کے لئے یہ بات ضروری ہوگی کہ منافع میں فریقین شریک ہوں، اس لئے دونوں میں سے کسی کے لئے بھی یہ بات صحیح نہیں ہوگی کہ وہ منافع کی متعین مقدار اپنے لئے مختص کرلے۔ مثلاً سرمایہ کار مضارب سے کہے کہ جتنا بھی منافع ہو تم مجھے ایک ہزار روپے مہینہ دیدینا۔ کیونکہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ منافع صرف ایک ہی ہزار روپے ہو۔ اس صورت میں سارا منافع سرمایہ کار کو مل جائے گا اور مضارب کو کچھ نہ مل سکے گا۔ جب کہ مضاربت کے صحیح ہونے کے لئے منافع میں فریقین کا اشتراک ضروری ہے۔

البتہ اگر فریقین میں سے کوئی ایک مشروط طور پر منافع کی متعین رقم اپنے لئے مختص کرلے، مثلاً سرمایہ کار کہے کہ اگر تین ہزار روپے منافع ہوا، تو دو ہزار روپے میرا ہوگا، تو یہ صورت جائز ہوگی[1]۔

(۷) منافع میں فریقین کا حصہ متعین ہو

عقد مضاربت کے صحیح ہونے کے لئے یہ بات بھی ضروری ہوگی کہ فریقین میں سے ہر ایک کا حصہ منافع میں تناسب کے ساتھ متعین ہو۔ جیسے ۵۰ فیصد، اس لئے کہ عقد کا بنیادی مقصد ہی منافع حاصل کرنا ہے، لہٰذا کوئی بھی ایسی صورت جس میں کہ منافع کی مقدار متعین نہ ہو پائے عقد کے منافی ہوگی۔ البتہ یہ سوال کہ منافع کی مقدار کیا ہو؟ اس سلسلہ میں فریقین آزاد ہیں، وہ باہمی رضامندی سے کوئی بھی مقدار طے کرسکتے ہیں[2]۔

---

(۱) الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/۸۴۹۔

(۲) ایضاً۔ حاشیہ ابن عابدین ۴/۴۸۴۔

جناب محمد حبیب الدین، ہمنا آباد

قادیانی فتنہ کا سنجیدہ جائزہ

فاضل مقالہ نگار پہلے قادیانی تھے، اب بحمد اللہ اپنے خاندان کے ساتھ مسلمان ہوئے ہیں، ان کی تعلیم کی زبان تلگو رہی ہے، لیکن جذبۂ ہمدردی اور بندگانِ خدا کے ساتھ نصح و خیر خواہی کے خیال سے پھر بھی اردو زبان میں اپنے خیالات کو قلمبند کیا ہے۔ امید ہے کہ مسلمان بھی اس تحریر سے فائدہ اٹھائیں گے، اور قادیانی حضرات بھی حقیقت پسندی کے ساتھ اس کا مطالعہ کریں گے، واللہ ولی التوفیق۔ (ادارہ)

یہ مقولہ مشہور ہے کہ "سونا گھس کے دیکھو اور انسان میں بس کے دیکھو تو اصلی، نقلی کا پتہ چلے گا"۔ اس کے علاوہ ایک مثل مشہور ہے کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"۔ ان تمہیدی اشاروں کے بعد عرض ہے کہ یہ ناچیز ایک عرصہ دراز سے قادیانی مذہب سے گہری وابستگی رکھتا تھا، مرزا صاحب کی کتابوں، لٹریچروں اور ترجمانوں کا مطالعہ اپنا مشغلہ بنایا ہوا تھا —— ظاہر ہے کہ جو شخص جن چیزوں سے مانوس ہوتا ہے اس کی خوبیوں کا ذکر کر کے لوگوں کا ذہن بھی اسی طرف مائل کرنا چاہتا ہے۔

یہی حال اس ناچیز کا بھی رہا، اکثر تعلیم یافتہ لوگوں اور علماء دین وغیرہ کے سامنے قادیانی تحریک کا پرچار کرتا تھا، یہ سلسلہ تقریباً ۱۵ سال تک رہا۔ اس دوران کچھ سنجیدہ علمی ذہنیت رکھنے والوں سے بھی دوستی رہی، جس کے نتیجہ میں کچھ ایسی کتابیں ملیں جن سے میرا ذہن کشادہ ہوا، حقیقت سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی، اس کے ساتھ ساتھ قادیانیت کے رد اور موافقت میں کتابیں پڑھتا گیا، جس سے میرے دل میں مختلف سوالات پیدا ہونا شروع ہوئے، اس کے بعد قادیانیوں کے علمی حلقوں میں اپنے ان سوالات کا ازالہ چاہا، لیکن ان کے جوابات سے مطمئن نہ ہو سکا، جس سے بحث و مباحثہ کا میدان گرم ہوا۔ آخر کار

مجھ پر یہ الزام دھرنے لگے کہ تم بزرگوں کے سلسلہ پر تنقید اور نکتہ چینی کرتے ہو، یہ بات اچھی نہیں، میرے سوالات سے وہ لاجواب ہو کر مرکز یعنی قادیان کو اور خلیفہ صاحب کو لکھ کر مجھ کو "مقاطعہ" اور "اخراج" از تنظیم جماعت کی سزا دلوائی، اس قسم کے رویہ سے مجھے پورا پورا یقین ہو گیا کہ یہ جماعت باطل ہے۔ اب یہ ناچیز کھلم کھلا ان کو مباحثہ کی دعوت دیتا رہا۔ آخرکار وہ لوگ یہ کہنے لگے کہ ہمارے پاس خلافت ہے، جس کے تحت بیت المال ہے، اس کے علاوہ تربیتی و تبلیغی پروگرام ہے، اشاعتِ اسلام کا سلسلہ ہے، اور یہی حقیقی اسلام ہے، یہ بات دیگر جماعتوں اور تنظیموں میں نہیں ہے۔ اب جو میں نے ان باتوں کو قرآن و حدیث کی کسوٹی پر پرکھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ دعویٰ بھی ان کے دوسرے دعووں کی طرح محض فریب ہے۔

قادیانی اسی خوش فہمی میں اپنے آپ کو ناجی قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو "ضالین" و "مغضوب" گروہ میں شمار کرتے ہیں، اور خود کو قرون اولیٰ کے مماثل سمجھتے ہیں ؎

بقدرِ پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
نہ ہو اگر یہ فریبِ پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

یہی وجہ ہے کہ خلفائے قادیان اپنے معتقدین کا ذہن پختہ بنانے میں کامیاب ہو گئے اور قادیانیوں کی نظر میں امیر المومنین کہلانے لگے، اس کی آڑ میں من مانی کرنے لگے، اور اس سے فائدہ اٹھا کر مختلف بہانوں سے اپنے مریدوں سے چندے، عطیہ، صدقے، شکرانہ فنڈ، شادی فنڈ، جلسۂ سالانہ فنڈ، مسجد فنڈ، زکوٰۃ، وقف کی ہوئی جائداد کا کرایہ اور بعض لوگوں کو اپنی جائداد کا ۱/۱۰ حصہ وقف کرانے کی تحریک پر وصول کی ہوئی رقومات، اور اسی طرح کے کئی ناموں سے پیسے وصول کر لیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رقومات بیت المال میں جمع ہوتی ہیں۔ آج تک کسی کو بھی یہ علم نہیں کہ یہ رقم کس پر کتنی خرچ کی جاتی ہے، خلیفہ صاحب نے کچھ ایسا قانون بنایا ہے کہ کسی کو بھی اس رقم کے تعلق سے حساب پوچھنے کا کوئی حق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی بھی ترجمان، یا کتابچہ میں بیت المال کی آمد و خرچ کا حساب نہیں بتایا گیا، ہر ماہ محصلین چندہ وصول کرنے اور مزید چندہ کے وعدہ کے

اضافہ کے لئے بھاری سفر خرچ کر کے قادیان سے آتے ہیں اور سیکڑوں روپے لے جاتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی ایسا عہدیدار نہیں آتا کہ مستحقین چندہ وامداد افراد کی نشاندہی کر کے جائے، حالانکہ جماعت میں کئی یتیم، ضرورت مند، پریشان حال، بیوہ اور معاشی بدحالی کے شکار موجود ہیں۔ یہ سب باتیں ان لوگوں میں لبس کر دیکھنے سے معلوم ہوئی ہیں۔

اس کے علاوہ یہ لوگ مسلمانوں کے خیر خواہ بھی نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب کبھی فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمان جانی ومالی پریشانیوں میں مبتلا ہوتے ہیں تو ان کے لئے ہمدردی کے چند کلمات تک نہیں کہتے، امداد واعانت تو دور کی بات ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو مسلمانوں سے کتنی ہمدردی ہے۔ ان لوگوں کا ایک نعرہ ہے، "محبت سب کے لئے، نفرت کسی سے نہیں"۔ اس نعرہ کے اسٹیکر اردو اور انگریزی میں چھپوا کر گھروں میں اور بیاجوں کی شکل میں لگائے پھرتے ہیں۔ بہر حال اس قسم کی اور بھی باتیں ہیں جو سننے میں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور عمل میں صفر، سچا اور حقیقی اسلام والوں کا یہ شیوہ نہیں ہوتا۔

ان کی اس خوش فہمی کی بنیاد، خلافت، بیت المال اور اشاعت اسلام کے پروگرام پر ہے۔ اب ہم ان کی اس بنیادی خوش فہمی کو قرآن وسنت کی کسوٹی پر پرکھیں گے، تاکہ قارئین کو سمجھنے اور تقابل کرنے میں آسانی ہو، کیونکہ وہ لوگ اپنے آپ کو حقیقی اسلام کے علمبردار سمجھتے ہیں۔

خلافت

وعد اللہ الذین الخ......... (سورۂ نور)

ترجمہ: تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالےٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو (اس اتباع کی برکت سے) زمین میں حکومت عطا فرمائے گا، جیسا کہ ان سے پہلے (اہل ہدایت) لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو (اللہ تعالیٰ) نے ان کے لئے پسند کیا ہے، یعنی اسلام (اس کو)

ان کے نفع آخرت کے لئے قوت دے گا۔ ان کے اس خوف کے بعد ان کو مبدل بامن کردے گا، بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں"۔

(ترجمہ: مولانا اشرف علی تھانویؒ)

اب یہاں خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمائیے، خلاصہ یہ کہ مومن بندوں سے اللہ تعالےٰ وعدہ فرمارہا ہے کہ زمین پر خلافت یعنی حکومت عطا فرمائیں گے، جیساکہ ان سے پہلے مومنوں کو خلافت یعنی حکومت دی تھی، پھر اس پر بھی کوئی مصیبت وخوف آن پڑے تو اس خوف کو امن میں بدل دے گا۔ (مزید تفصیلات کے لئے دیکھو معارف القرآن)

جب قرآن کریم صاف طور پر خلافت کا لفظ استعمال کرکے "حکومت واقتدار" مراد لے رہا ہے تو ہم کو کیا حق ہے کہ اس کی تاویل کرکے ظلّی خلافت، بروزی خلافت، لغوی خلافت کے چکر میں جائیں۔

جو تصور خلافت کے تعلق سے قرآن اور تاریخ اسلام دیتا ہے اس کے بالکل برعکس قادیانیوں کی خلافت چل رہی ہے، ان کے پاس اقتدار تو کیا دور دور تک اقتدار کا نام ونشان تک نہیں، پھر شریعتِ محمدی کو نافذ کیا کریں گے؟ خلیفہ قادیان خود دوسری حکومت کا مطیع وفرماں بردار ہے، اس کے علاوہ خوف کو امن میں تبدیل کرنے کا وعدہ بھی ہے، لیکن قادیانی خلیفہ صاحب اس سے مستثنیٰ معلوم ہوتے ہیں، تب ہی تو پہلے ہیڈ کوارٹر (قادیان) سے خوف کے عالم میں ربوہ (پاکستان) چلے گئے۔ پھر خوف نے زوردار تعاقب کیا تو اب لندن میں پناہ لئے ہوئے ہیں۔

جب خلیفہ خود کسی حکومت کا مطیع ہو اور خوف کے مارے ادھر ادھر پناہ لیتا ہو تو آپ غور فرمائیں کہ قرآن خلافت کے تعلق سے جو تصور پیش کررہا ہے وہ کہاں تک پایا جارہا ہے؟ خلیفہ کی یہ شان نہیں ہوتی کہ خوف کے مارے اپنے ہیڈ کوارٹرس تبدیل کرتے جائیں، بلکہ ان کو جہاد کرنا چاہئے۔

اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ قادیانی خلیفہ صاحب کی خلافت (حکومت) اپنے ماننے والوں تک محدود ہوگی، تو بھی ان کی خلافت تشنۂ ثبوت ہے، کیونکہ ان کے ماننے والوں میں

تقریباً ایک صدی کے دوران سیکڑوں چور، زانی اور زکوٰۃ نہیں دینے والے پائے گئے ہوں گے، لیکن آج تک شریعتِ محمدی کے تحت نہ کسی کا ہاتھ کاٹا گیا، نہ کسی کو سنگسار ہی کرنے کا حکم اور نہ ہی زکوٰۃ دینے والوں کے خلاف جہاد کیا، جب کہ قرونِ اولیٰ میں بعض کمزور مومن اس قسم کے گناہ کرتے تو خلفاء شریعت کے تحت سزائیں دیتے تھے۔

قرونِ اولیٰ میں عدلیہ ایسی تھی جہاں خلیفہ کی غلطی یا ناانصافی پر عام آدمی کی طرح انہیں مجرم کے طور پر پیش کیا جاتا تھا، تاکہ انصاف ملے۔ لیکن قادیانیوں کے پاس کچھ قانون ہی ایسا بنا ہے کہ خلیفہ کے تعلق سے کچھ بھی ہو برا بھلا نہیں پوچھ سکتے۔ قادیانیوں کے پاس عدالت ہی نہیں، خلیفہ جو چاہے، جس کو چاہے جماعت میں رکھ سکتا ہے اور جسے چاہے نکال سکتا ہے، کسی کو انصاف طلب کرنے کا حق نہیں۔ اسلام میں خلفاء کی شان یہ تھی کہ ہر کہ ومہ ان سے مل سکتا تھا، مگر خلافتِ قادیانیت کا یہ حال ہے کہ ایک عام آدمی خلیفہ سے نہیں مل سکتا، تاوقتیکہ مقامی عہدیدار یہ سند نہ دیدیں کہ یہ شخص ملنے کے قابل ہے۔

یہاں پر میں اپنے بڑے بھائی مولوی ولی الدین صاحب مرحوم کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ انتقال سے ایک سال پہلے جب کہ قادیانی جماعت سے اختلافات کا سلسلہ شروع ہوا تھا خلیفہ صاحب کے پاس رپورٹ پہونچی تھی کہ یہ شخص جماعت سے شدید اختلاف رکھتا ہے اور پائے کا مناظر بھی ہے۔ چنانچہ میرے بڑے بھائی لندن گئے، اور خلیفہ صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، لیکن عہدیدار نے خلیفہ سے ملاقات کرانے سے انکار کر دیا، میرے بھائی نے یہاں تک کہا کہ اگر آپ کو مجھ پر یہ شک ہے کہ میں مہلک ہتھیار رکھتا ہوں تو آپ تلاشی کے بعد ملنے دیں، پھر بھی اجازت نہیں مل سکی۔ تو یہ ہے اس خلافت ضالہ کا نمونہ!

قرونِ اولیٰ میں تو ایک معمولی سے معمولی آدمی بھی خلیفہ سے کبھی بھی مل سکتا تھا، کوئی پہرے دار مقرر نہ تھا، بلکہ خلفاء خود اپنی عوام کی خبر گیری کے لئے گشت لگایا کرتے تھے، بہرحال قادیانی خلافت اور اسلامی خلافت میں یہی امتیاز ہے۔

اس کے علاوہ خلافت مرزا صاحب کے خاندان کی حد تک محدود ہے، کوئی باہر کا شخص خلیفہ نہیں بن سکتا، پہلے خلیفہ اس لئے باہر کے تھے کہ مرزا صاحب کے فرزند ابھی نا بالغ تھے، پھر بھی پہلے خلیفہ کے بعد صرف ۲۲ سال کی عمر میں بے دام اور مفت خلافت مل گئی اس کے بعد خلیفہ دوم مرزا محمود نے اس خلافت کے زیر سایہ کیا کچھ کیا؟ وہ محتاج بیان نہیں۔ قادیانی کہتے ہیں کہ یہ سلسلہ قیامت تک چلے گا، اسی لئے "سلسلہ عالیہ احمدیہ" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، دوسری طرف اجرائے نبوت کے بھی قائل ہیں، یہ محض مرزا صاحب کی نبوت غیر واقعی "کو ثابت کرنے کی کوشش ہے، لیکن دبی زبان سے انقطاع نبوت کے بھی قائل ہیں، کیونکہ قیامت تک خلافت چلے گی، پھر نبوت کی کیا ضرورت باقی رہی، گویا مرزا صاحب ہی آخری نبی ہیں۔ بہر حال اس قسم کے تضاد سے یقین ہوتا ہے کہ نہ نبوت صحیح ہے اور نہ ہی اس پر مبنی خلافت۔

بیتُ المال

آج قادیانیوں کے پاس ایک نام نہاد "بیت المال" ہے، ان کا خیال ہے کہ خلیفہ کی زیر نگرانی چلنے والا بیت المال قرونِ اولیٰ کے بیت المال کی طرح ہے، اس بیت المال میں مختلف قسم کے چندے، صدقات، زکوٰۃ، عطیات، نیز وقف کی ہوئی جائیداد کا کرایہ وغیرہ جمع ہوتا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ اس طرح لاکھوں روپے سالانہ جمع ہوتے ہیں۔

لیکن جن مدات میں خرچ کا ذکر قرآن پاک میں ہے، ان کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا، اس میں سے غریبوں، یتیموں، ضرورت مندوں، مسافروں، نومسلموں، مقروضوں وغیرہ کو دیا جانا چاہیئے۔ دوم قادیانیت میں طویل عرصہ پھنسے رہنے کے باوجود ہمارے مشاہدے میں توان مدات میں خرچ ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ تقریباً ایک صدی سے یہ کاروبار چل رہا ہے، لیکن آج تک آمد و صرف کے تعلق سے کوئی رپورٹ شائع نہیں ہوئی، اتنا ضرور ہے کہ اس رقم میں سے چند کتابیں شائع کرتے ہیں، کچھ ملازمین کی تنخواہوں پر

اور بعض نامکمل مساجد کی تعمیر کے سلسلے میں یہ پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ باقی رقم کا بڑا حصہ خلیفہ صاحب اور ان کے خاندان پر خرچ ہوتا ہے۔

اس کے برخلاف قرونِ اولیٰ کا جو بیت المال تھا، اس میں ہر ایک کا حق تھا، قرآن مجید کے بتائے ہوئے مدات میں خرچ کیا جاتا تھا، خلیفۂ وقت جو تنخواہ بیت المال سے لیتا تھا وہ ایک معمولی ملازم کی تنخواہ کے برابر ہوتی تھی، حساب و کتاب بالکل صاف ہوتا تھا، اعتراض کرنے والوں کو حساب بتا کر مطمئن کیا جا سکتا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلامی بیت المال اور قادیانیوں کے بیت المال میں زمین آسمان کا فرق ہے، اس غیر اسلامی بیت المال کو اسلامی بیت المال کہنا کس حد تک درست ہے؟ غالباً اس کو بھی ظلّی، بروزی، لغوی بیت المال وغیرہ کہتے ہوں گے۔

تبلیغ اسلام کا کام

اسلام کا ایک اہم شعبہ تبلیغ دین ہے، دنیا کے کونے کونے میں بسنے والی قومیں اسلام سے ناواقف ہیں، جو مختلف رنگ و نسل اور زبانوں میں بٹے ہوئے ہیں، قادیانی حضرات دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ لوگ اس اہم کام کو کامیابی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں، اسی لئے یہ جماعت صحیح معنوں میں خدمتِ دین کر رہی ہے، جس کے نتیجہ میں بعض عیسائی، یہودی اسلام کی آغوش میں آ رہے ہیں۔

یہ لوگ عام لوگوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہیں، کہتے ہیں کہ ہماری جماعت امریکہ، جاپان، چین، روس، انڈونیشیا وغیرہ وغیرہ ممالک میں قادیانیت پھیلا رہی ہے، اور کئی لوگ حقیقی اسلام یعنی قادیانیت میں داخل ہو رہے ہیں، ان کا یہ پروپیگنڈہ صرف ڈھکوسلہ کی حد تک ہے، اس میں شک نہیں کہ بعض لوگ حصولِ روزگار کی خاطر یہاں سے چلے جاتے ہیں، قادیانی پر چارک بھی جاتے ہیں، ایسی صورت میں دس بیس لوگ جمع ہوتے ہیں تو یہ نام دیتے ہیں کہ فلاں فلاں ملک میں جماعت ہے، کم از کم ۳ افراد بھی کسی ملک میں مل جائیں تو لغوی اعتبار سے جماعت ہی کہلائے گی، کیوں کہ ان کے یہاں

تاویلات کے چوپٹ دروازے کھلے ہیں۔

دیگر ممالک میں یہ پروپگنڈہ کرتے ہیں کہ ہندوستان میں کثرت سے احمدیت، یعنی قادیانیت پھیل رہی ہے، جیسے ورنگل کے اطراف واکناف کے علاقے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ورنگل کے اطراف میں ان پڑھ اور جاہلوں کی اکثریت ہے اور قادیانی حضرات ایسے ہی لوگوں کے پاس جاکر ان کے یہاں مسجد بنانے، مدرسہ کھولنے کا ذکر کرکے بیعت فارم پر دستخط لے کر قادیان بھیج دیتے ہیں، بے چارے دستخط کنندگان سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنے بھلائی اور بہتری کے فارم پر دستخط کئے ہیں، نہ کہ مذہب بدلنے کے فارم پر اور قادیانی اپنے گمان کے مطابق ان کو قادیانی بنالیتے ہیں۔

بہرحال مختلف طریقے سے عوام کو اور کچھ دور دراز رہنے والے قادیانیوں کو بیوقوف بناکر جتاتے ہیں کہ ہم لوگ روز بروز ترقی کرتے جارہے ہیں۔ یہ بات ہمیں اس طرح معلوم ہوئی کہ میرے والد صاحب چند ماہ ورنگل میں کام کرتے رہے تھے ——— وہاں کی اس طرح کی اندھا دھند دھاندلیوں کو دیکھ کر انہوں نے خلیفہ سے شکایت بھی کی تھی کہ یہ لوگ محض فضول دھوکہ دے رہے ہیں۔

غرض ادھر رہنے والے لوگوں کو یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے باہر روز بروز احمدی یعنی قادیانی بنتے جارہے ہیں، تعداد میں لاکھوں کا اضافہ ہوتا جارہا ہے اور دیگر ممالک میں رہنے والے لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ ہندوستان میں جماعتِ احمدیہ بہت تیزی سے بڑھتی جارہی ہے، یہاں تک کہ گاؤں کے گاؤں قادیانیت قبول کرتے چلے جارہے ہیں۔ حالانکہ یہ محض پرفریب اور غیر واقعی پروپگنڈہ ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں تقریباً ۲۰ زبانیں لکھی پڑھی جاتی ہیں، ان کے پاس پرچار کرنے والوں کی تعداد صرف اردو جاننے والوں کی ہے اور وہ بھی ایک درجن سے زیادہ نہیں ہیں، دیگر زبانوں میں تبلیغ قادیانیت کے لئے مبلغین ہی نہیں ہیں' بڑی مشکل سے ہندوستان میں قرآن کے تراجم دو تین زبانوں میں ہی ہوئے ہیں' ان میں بھی دل کھول کر من چاہی تحریف و تصحیف کی گئی ہے اور "یضل بہ کثیرا" کا مصداق گمرہی کا معقول راستہ بتایا گیا ہے۔

یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ بیرونی ممالک میں کئی زبانوں میں قرآن پاک کے تراجم کئے ہیں شاید اس کی نمائش بھی ہوئی ہے، حالانکہ بعض زبانوں میں صرف دو تین پاروں کا ترجمہ کیا ہے اور اسی پر فخر سے پھولے نہیں سماتے اور دھوکہ دیتے رہتے ہیں، اس کے علاوہ محض چند رسائل ریکارڈ کے لئے باہر ممالک میں شائع کر کے ثابت کرتے ہیں کہ وہاں پر ہمارا ترجمان شائع ہوتا ہے۔

خلافت، بیت المال اور تبلیغی کام پر مختصرًا روشنی ڈالنے کے بعد ایک بات اور بھی سمجھنے کی ہے اور وہ یہ ہے کہ:

نظامِ عیسائیت کی نقل

رومن کیتھلک فرقہ میں ایک نظام رائج ہے، جس کے مطابق ہر فرد جو جنت کا متمنی ہے اپنی جائیداد کا ۱/۱۰ حصّہ پوپ (خلیفہ) کے حوالے کر دے، جس پر پوپ کی نجات کی سند لے کر میت کے ساتھ دفن کر دیا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پوپ کی جنت کی سفارش اللہ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔

اسی قسم کا نظام قادیانیوں میں بھی مرزا غلام احمد کے ایک خواب کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے، جس میں یہ بتا دیا گیا تھا کہ قادیان میں ایک خاص قطعہ (جس کو بہشتی مقبرہ کہا جاتا ہے) ہے جس میں ہر وہ فرد جو جنت کا متمنی ہے اپنی جائیداد کا ۱/۱۰ حصّہ دے کر اپنا نام جنتی لوگوں کی لسٹ میں بک کرا سکتا ہے اور اس کو جنت کی گارنٹی حاصل ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ مرزا خاندان جائیداد کا ۱/۱۰ حصّہ دئے بغیر اس خاص قطعہ (جس کو بہشتی مقبرہ کہتے ہیں) میں دفن ہو سکتا ہے۔

جب تک قادیان میں خلیفہ کا ہیڈ کوارٹر رہا اس وقت تک صرف مقامِ قادیان میں بہشتی مقبرہ تصور کیا جاتا تھا، اس کے بعد جوں ہی ہیڈ کوارٹر قادیان سے ربوہ (پاکستان) منتقل ہوا، وہاں پر بھی ایک ظلی بہشتی مقبرہ قائم ہوا ... ...

... ...

اس طرح دو بہشتی مقبرہ ہے۔ پھر اس کے بعد ربوہ (پاکستان) سے لندن منتقل ہوا، وہاں پر بھی ایک بروزی بہشتی مقبرہ قائم ہوا، اس طرح ان کے بہشتی مقبرے ظلی، بروزی، لغوی وجود میں آتے رہے ہیں کہ قادیانیت کے لئے اس توسیع کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ یہاں پر ایک قابلِ غور نکتہ ہے کہ قرآن کے مطابق ترکہ دینا ضروری ہے، لیکن ترکہ کے بغیر بہشتی مقبرہ میں ۱/۱۰ حصہ دے کر دفن ہو سکتا ہے، ان سے کسی قسم کی پوچھ گچھ نہیں کی جاتی۔ اب میں ان قادیانیوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا بہشتی مقبرہ یا ۱/۱۰ حصہ دے کر وہاں دفن ہونا اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے؟ اگر یہ غیر اسلامی طریقہ ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جماعت کس طرح قرونِ اولیٰ کے مشابہ تصور کی جائے گی؟

اسی بناء پر ہم سب بھائیوں نے بحمداللہ اس گمراہ جماعت سے علیحدگی اختیار کی ہے۔ طویل تجربہ اور مطالعہ کے بعد ہمارا پختہ ایقان ہے کہ یہ جماعت جھوٹی اور اسلامی تعلیمات سے دور اور من مانی تاویلات سے بھرے ہوئے اصول پر مبنی ہے اور مرتد و زندیق ہے۔

ایک وضاحت

میں نے اپنی اس تحریر میں جا بجا ان لوگوں کے لئے قادیانی کا لفظ استعمال کیا ہے، یہ لوگ اس پر بہت چراغ پا ہوتے ہیں، حالانکہ کسی مسلمان کو مکہ مدینہ کی طرف منسوب کر کے "مکی" و "مدنی" کہا جائے تو وہ اس پر نہ صرف خوش ہوتا ہے، بلکہ اس نسبت کو باعثِ افتخار سمجھتا ہے۔ اور خود یہی حضرات جماعتِ اسلامی کے لوگوں کو "مودودی پارٹی" کہنے میں کوئی تکلیف محسوس نہیں کرتے۔ اصل میں ایک طبقہ کسی نام سے معروف ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں اس نام سے اس کا ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس لئے قادیانی حضرات سے درخواست ہے کہ چڑنے کے بجائے سنجیدگی کے ساتھ ان نکات پر غور کریں اور حقائق کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

ترتیب : مولوی شکیل احمد رحمانی (تخصص فی الفقہ)

فقہی مذاکرہ

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہٗ ہر انگریزی مہینے کے پہلے منگل کو ارم کا ٹیج حیدرآباد میں سوالات کے جواب دیتے ہیں، جس میں عوام وخواص، علماء اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کی بڑی تعداد شریک ہوا کرتی ہے۔ اسی سلسلہ کا ایک مذاکرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے، جس کو مولوی عبید اللہ سبیلی نے ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے نقل کیا ہے، اور مولوی شکیل احمد رحمانی، متعلم تخصص فی الفقہ نے ضروری حوالہ جات کی تخریج کی ہے اور عنوانات لگائے ہیں —— امید ہے کہ قارئین اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ (ادارہ)

مُردہ پیدا ہونے والے بچہ پر نمازِ جنازہ

جو بچہ مرا ہوا پیدا ہوا اس کو دفنانے سے پہلے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں، آیا اس کو غسل دیا جائے، کفن پہنایا جائے اور نماز جنازہ پڑھی جائیگی یا نہیں؟

جو بچہ مرا ہوا پیدا ہوا اس پر نمازِ جنازہ نہیں ہے[1]، اور چونکہ نمازِ جنازہ پاک ہی پر پڑھی جاسکتی ہے، ناپاک پر نہیں پڑھی جاسکتی، اسلئے غسل کا حکم دیا جاتا ہے۔ جب نمازِ جنازہ نہیں ہے تو غسل کا حکم بھی نہیں[2]، اور کفن پہنانا بھی نہیں ہے، یونہی کسی کپڑے میں لپیٹ کر دفن کردیا جائے تو کافی ہے۔

قبر پر نمازِ جنازہ

بالغ یا نابالغ میت کو بغیر نمازِ جنازہ کے دفن کردیا جائے تو ایسی صورت میں

(۱) فاتفقت الروایات علی انہ لا یصلی علی من ولد میتا۔ بدائع الصنائع ۱/۳۰۲۔
(۲) واذا لم یستھل لم یسم ولم یغسل ولم یرث۔ بدائع ۱/۳۰۲۔

کیا حکم ہے؟ ایا ایسی حالت میں قبر پر نماز جنازہ ادا کریں، جب بھی اطلاع ملے، مثلاً ایک ماہ سے زائد یا ایک سال سے زائد؟

اصل میں اس صورت میں اصول یہ ہے کہ جب تک لاش پھول پھٹ نہ جائے اس وقت تک نمازِ جنازہ پڑھی جا سکتی ہے، اگر تدفین سے پہلے ہی لاش ریزہ ریزہ ہوگئی اور پھٹ گئی تو اس پر نمازِ جنازہ نہیں ہے۔ فقہاء نے اندازہ لگایا ہے کہ تین دن میں لاش پھول پھٹ اور سڑ جاتی ہے، اگر نمازِ جنازہ نہیں پڑھی گئی ہے تو قبر پر نماز جنازہ پڑھنے کی گنجائش ہے[1] اور خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی ہے[2]۔ تین دنوں کے بعد نمازِ جنازہ نہیں پڑھی جا سکتی، یونہی اس کے لئے دعائے مغفرت کی جانی چاہیے۔

تشہد پورا نہ ہوا اور امام صاحب کھڑے ہو جائیں

مقتدی تشہد نہ پڑھ سکا اور امام صاحب تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہو گئے، ایسی صورت میں امام کی اتباع کی جائے، یا تشہد پورا کیا جائے؟ اسی طرح دعاء ماثورہ نہیں ہوئی اور امام صاحب سلام پھیر دیں تو ایسی صورت میں مقتدی کو کیا کرنا چاہیے؟۔

پہلی صورت میں صورتِ حال یہ ہے کہ تشہد پڑھنا بھی واجب ہے اور امام کی اتباع بھی واجب ہے، لہٰذا اگر وہ تشہد مکمل کر کے امام کو تیسری رکعت میں پا سکتا ہے تو بہتر یہ ہے تشہد مکمل کر کے امام کو پانے کی کوشش کرے[3]۔

دوسری صورت میں کہ جس میں دعاء کے کچھ الفاظ باقی رہ گئے ہیں اور امام صاحب سلام پھیرتے ہیں تو آخری دعاء پڑھنی صرف مسنون یا مستحب ہے اور امام کی اتباع میں جہاں تک ممکن ہو عجلت واجب ہے، اس لئے بہتر ہے کہ امام کے ساتھ سلام پھیر دے۔

---

(۱) ولو دفن بعد الغسل قبل الصلوٰۃ علیہ صلی علیہ فی القبر ما لم یعلم انہ تفرق وفی الامالی عن ابی یوسف انہ قال یصلی علیہ الی ثلثۃ ایام وما بعد الثلاثۃ ایام لا یصلی لان الصلوٰۃ مشروعۃ علی البدن وبعد مضی الثلاث ینشق ویتفرق فلا یبقی البدن ۳۱۴/۱۔ (۲) فلما روینا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی علی قبر تلک المرأۃ۔ بدائع ۳۱۵/۱

(۳) فی الدر المختار فصل فی صفۃ الصلوٰۃ بخلاف سلامہ او قیامہ لثالثۃ قبل اتمام المؤتم التشہد فانہ لا یتابعہ بل یتمہ لوجوبہ۔

اسی طرح رد المحتار میں بھی نقل کیا گیا ہے[1]۔

نقد و ادھار قیمت میں فرق

کوئی سامان اُدھار فروخت کیا جائے اور قسط پر قیمت وصول کی جائے اور نقد و ادھار قیمت میں فرق کیا جائے، کیا یہ جائز ہے؟

اگر فروخت کے وقت یہ بات معلوم کرلی جائے کہ تم یہ سامان نقد خرید رہے ہو یا ادھار، اور ادھار کی قیمت زیادہ مقرر کی جائے اور بالاقساط اس کی قیمت وصول کرلی جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ ہاں اگر اس طرح کی شرط لگائی جائے کہ دس مہینوں میں قیمت ادا کردی جائے تو اتنے پیسے ہوں گے، اگر گیارہواں مہینہ گذر گیا تو مزید اتنے پیسے لئے جائیں گے، تو اب یہ "ربا" وسود ہو جائے گا اور یہ ناجائز ہے۔ بہرحال نقد و ادھار کی قیمت میں فرق کرنے میں مضائقہ نہیں ہے، کتب فقہ میں اس کی صراحت موجود ہے[2]۔

سود کی حقیقت اور سود اور تجارت میں فرق

سود کی حقیقت کیا ہے؟ اور سود اور تجارت میں کیا فرق ہے؟

دیکھئے! اصل میں دنیا میں بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جس میں آپ سے آپ اضافہ ہوتا ہے، مثلاً جانور ہیں، یہ جانور آپ نے کسی کے پاس رکھ دئے، تو سال بہ سال توالد و تناسل کے ذریعہ جانوروں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، لیکن روپے پیسے ایسی چیز ہے کہ اگر اس کو آپ اپنے پاس رکھ لیں تو روپے میں اس بات کی صلاحیت نہیں ہے کہ روپے سے

---

(۱) لایتابعہ ای ولو خاف ان تفوتہ الرکعۃ الثالثۃ مع الامام کما صرح فی الظہیریۃ وشمل باطلاقہ مالو اقتدی بہ فی اثنا التشہد الاول او الاخیر فحین قعد قام امامہ و مقتضاہ انہ یتم التشہد ثم یقوم۔ (۲) رجل باع علی انہ بالنقد کذا وبالنسیئۃ بکذا او یجوز الی شہر بکذا والی شہرین بکذا لم یجز کذا فی الخلاصۃ۔ (امداد الفتاوی۔ ۵/۲۰)۔

خود روپیہ پیدا ہوتا چلا جائے، تو ایسی چیزیں کہ جن میں از خود اضافے کی صلاحیت نہ ہو کوئی شخص کسی کو بطور قرض یا امانت کے دے اور وہ اس میں اضافہ وصول کرنا چاہے تو اس کو شریعت کی اصطلاح میں سود کہتے ہیں۔ سود اور تجارت میں ایک بڑا فرق ہے بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں میں مہلت کی قیمت لی جاتی ہے۔ مثلاً آپ نے پانچ سو روپے میں ایک سامان خریدا اور ایک سال وہ سامان آپ کے پاس رہا اور چھ سو روپے میں اس کو فروخت کیا تو سو روپے بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس مہلت کی قیمت ہے، جس میں ہمارے پانچ سو روپے منجمد رہے، اور اگر ہم نے کسی کو پانچ سو روپے بطور قرض دیا اور سال بھر کے بعد اس سے چھ سو روپے وصول کیا، یہاں بھی ہم نے سو روپے لئے جس کو سود کہتے ہیں، یہاں بھی سو روپے اسی مہلت کی قیمت ہے، لیکن دونوں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ سود خوار اپنے لئے کسی (Risk) اور خطرے کو قبول نہیں کرتا، وہ متعین کر دیتا ہے کہ مجھ کو بہر حال سو روپے پر نفع لینا ہے۔ اس کو شریعت منع کرتی ہے، اور تاجر جو ایک سامان چھ سو روپے میں فروخت کرتا ہے، تو در اصل اس خطرے کو قبول کرتا ہے کہ ممکن ہے کہ بازار کے حالات کی وجہ سے یہ پانچ سو روپے کی چیز چار سو ہی میں فروخت کرنی پڑے، ہو سکتا ہے کہ پانچ سو میں ہی بک جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سو روپے نفع آجائے۔ تو شریعت نے جو کہا کہ سود ایسی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے برکت کو ختم کر دیتا ہے اور تجارت کے بارے میں رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے برکت کو تجارت سے وابستہ کر دیا ہے، ان دونوں میں فرق یہی ہے کہ تاجر اللہ تعالےٰ پر توکل اور بھروسہ رکھتا ہے اور سود خوار اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ نہیں کرتا اور یہ بہت بڑا فرق ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے کہا ہے: "احل اللہ البیع وحرم الربوا" اللہ تعالےٰ نے بیع اور تجارت کو حلال کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ربوا اور سود کو حرام کیا ہے۔

کیا زیورات کے لئے کان اور ناک میں سوراخ تغیر خلق اللہ میں داخل ہے؟

عورتیں کانوں میں زیورات کا استعمال کرتی ہیں، اس مقصد کے لئے کان، ناک میں

سوراخ کرنا جائز ہے؟ یا یہ تغیر خلق اللہ میں داخل ہے؟

قرآن مجید میں جو اللہ تعالیٰ کی خلقت میں تغیر اور اس میں کسی تبدیلی سے منع کیا گیا ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ جسمِ انسانی میں کوئی ایسا تغیر نہ کیا جائے، جو اللہ تعالیٰ کے منشاء اور فطرت کے مقصد کے خلاف ہو، مثلاً اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر قوت توالد و تناسل رکھا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسانی نسل کی افزائش ہو۔ اب اگر کوئی آدمی نسبندی کرلے تو اللہ تعالےٰ کا جو مقصود ہے انسانی جسم کے بعض اعضاء کی تخلیق کا وہ اس پر حملہ زن ہوتا ہے، اس پر گویا روک لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر جانور کو آختہ کیا جائے اور اس کے خصیتین نکال دئے جائیں تو یہ جائز ہوگا یا نہیں؟ فقہاء نے لکھا ہے کہ جائز ہوگا، اسلئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تغیر نہیں، کیونکہ جانوروں کا منشاء تخلیق ہی یہ ہے کہ وہ انسانوں کی خوراک بنے اور فوطوں کے نکال دینے کی وجہ سے باعتبار خوراک کے اس کی لذت بڑھ جاتی ہے، پس یہ مقصد تخلیق کی تکمیل ہے، نہ کہ اس میں تغیر۔[1] قرآن مجید میں عورتوں کے بعض حصوں کو مواضع زینت قرار دیا گیا ہے، اس میں چہرہ بھی داخل ہے، سینہ کا حصہ اور ہاتھ بھی ہے، جہاں عورتیں زیورات پہنتی ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ عورتوں کے ان اعضاء تخلیق میں قدرت کا ایک منشاء ان کا زینت و آرائش کا باعث بننا بھی ہے اور یہ بعض صورتوں میں موقوف اسی پر ہوتا ہے کہ کان ناک وغیرہ میں سوراخ کئے جائیں، اس لئے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے ——— خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور مختلف صحابیات سے ثابت ہے کہ اس زمانہ میں بھی عورتیں کان میں کچھ پہنا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ عید کے موقع سے آپؐ نے عورتوں کو صدقات کی ترغیب دی تو صحابیاتؓ نے آئرنگ وغیرہ صدقہ کیں۔[2] اس لئے قرآن مجید میں جس تغیر خلق کی ممانعت کی گئی ہے، یہ اس میں داخل نہیں ہے۔

---

(۱) جواز خصاء البهائم بالمنفعة وهی ارادة سمنها، لاباس بکی البهائم للعلامة وثقب اذن الطفل من البنات لانهم کانوا یفعلونه فی زمن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من غیر انکار۔

(۲) سئل ابن عباس اشهدت مع رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم العید قال نعم، ثم اتی النساء فوعظهن وذکرهن وامرهن بالصدقة فرایتهن یهوین الی اذانهن وحلوقهن یدفعن الی بلال۔ (مشکوٰۃ ۱/۱۲۵۔

آیت میں صرف خیر ہی کی نسبت اللہ کی طرف کیوں کی گئی؟

قرآن مجید کی آیت "بیدك الخیر انك علیٰ كل شیٔ قدیر" آپ ہی کے ہاتھ میں تمام تر خیر ہے، اور بیشک آپ ہر چیز پر قادر ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے صرف خیر کا ذکر ہے، شر کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ خیر و شر دونوں کا خالق ہے۔

اصل میں بات یہ ہے کہ یہاں باری تعالیٰ کے ادب کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اس سلسلہ میں ایک بڑی مثال سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ خدا اور رسول ؐ کے مرتبہ شناس ہوتے ہیں، جب وہ اللہ اور رسول ؐ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی زبان میں ایک خاص قسم کی تہذیب و شائستگی پیدا ہو جاتی ہے، جس کا ذوق حلاوتِ ایمانی سے پیدا ہوتا ہے، قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک قول نقل کیا ہے کہ میرا رب وہ ہے کہ جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہ مجھے شفاء عطا کرتا ہے۔ "واذا مرضت فھو یشفین"۔ غور کیجئے کہ بیماری بھی اللہ کی طرف سے ہے اور شفاء بھی، لیکن بیماری کی نسبت اپنی طرف کی واذا مرضت (جب میں بیمار پڑتا ہوں) اور شفاء کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی۔ "فھو یشفین"۔ یہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کمال ادب تھا کہ جس میں "شر" کا کوئی پہلو نکلتا تھا اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے سے گریز فرمایا اور جو خیر کا پہلو تھا اس کی نسبت صریحاً اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی۔ سیدنا حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے ان سے ایک صاحب نے پوچھا کہ آپ بڑے ہیں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ تھا کہ میں بڑا ہوں، اسلئے کہ وہ غالباً چھ ماہ کے بڑے تھے لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بڑا لطیف جواب دیا، فرمایا: "انا اسن وھو اکبر" (وہ بڑے ہیں، میری عمر زیادہ ہے) تو اس بات کی کوشش کی جاتی تھی کہ کسی بات کا جواب دیا جائے یا کلام کیا جائے تو اس میں ادب کا پورا پورا خیال رہے۔ قرآن مجید کی اس آیت میں بھی اصل یہی ہے۔ "بیدك الخیر"۔

یہ ادب کا تقاضہ ہے کہ خیر ہی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے،

گوشر(۱)، بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، اور اس کی خالقیت سے دنیا میں وجود پذیر ہوا ہے۔

حرام ذریعہ معاش والوں سے اجرت لینا

ایسا شخص جس کے متعلق معلوم ہو کہ اس کا ذریعہ معاش حرام آمدنی ہے، یا آمدنی کا ایک حصہ حرام ہے، اس سے اجرت حاصل کرنا درست ہے یا نہیں؟۔

اس سلسلہ میں تفصیل یوں ہے کہ جو شخص اجرت حاصل کر رہا ہے، اگر اس کو یقینی طور پر معلوم ہو کہ جو مال حرام طریقہ پر حاصل کیا گیا ہے وہ یہی مال ہے، تب تو فقہاء اس کو منع کرتے ہیں۔

فقہاء کہتے ہیں کہ کسی شخص نے کسی کا مال غصب کر لیا ہو، وہ کسی کو اپنے یہاں اجیر رکھے اجیر جانتا ہے کہ یہ مالِ مغصوب ہے اور اسی مالِ مغصوب سے اس کی اجرت ادا کر رہا ہے تو اجیر کے لئے اس اجرت کا قبول کرنا جائز نہیں۔ لیکن ایک شخص کا ذریعۂ آمدنی حرام بھی ہے اور حلال بھی، دونوں طرح کے ذرائع ہیں اور ہمیں یقینی طور پر معلوم نہیں کہ یہ اجرت جو ہمیں ادا کی جارہی ہے مالِ حرام سے ادا کی جارہی ہے تو ایسے شخص سے مزدوری قبول کرنا اور اجرت وصول کرنا جائز ہے، ہاں احتیاط اور تقوے کی بات اور ہے کہ آپ ایسے شخص کے یہاں کام کرنے ہی سے گریز کریں۔

زکوٰۃ ادا کرنے میں کس دن کی قیمت معتبر ہوگی؟

ایک شخص کو یکم رجب کو زکوٰۃ ادا کرنی تھی، مگر وہ یکم محرم کو زکوٰۃ ادا کرتا ہے تو زکوٰۃ کس دن کی قیمت پر ادا کرے؟ یعنی یکم رجب کو زکوٰۃ ادا کرنی تھی، اور فرض کیجئے کہ اس وقت سونے کی قیمت تین ہزار روپے تھی اور آج یکم محرم کو ادا کر رہا ہے، تو سونے کی قیمت

---

(۱) بیدك الخیر ای بقدرتك ای الخیر والشر - جلالین ۱/۶۲ - دار الکتاب العربی، بیروت۔

پانچ ہزار روپے ہے تو زکوٰۃ وہ ادا کرے گا تو کس قیمت پر؟

اس سلسلہ میں تھوڑا سا اختلاف ہے، امام ابو حنیفہؒ کے یہاں جس دن اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، یعنی یکم رجب کی تاریخ، اسی لحاظ سے اسے زکوٰۃ ادا کرنی ہے، اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ (یہ دونوں ان کے ممتاز تلامذہ ہیں) کے نزدیک یکم محرم کے لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی[1]۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ فی زمانہ اس مسئلہ میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی رائے زیادہ صحیح ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ زکوٰۃ چاہے یکم رجب کو ادا کی جائے یا یکم محرم کو، اللہ تعالیٰ نے ہم پر روپے اور پیسے کی ادائیگی واجب نہیں کی ہے، بلکہ اس سونے اور چاندی کا ایک حصہ ہمیں ادا کرنا فرض ہے، تو اس کا تقاضہ ہے کہ ہمیں یکم محرم کو اتنے پیسے ادا کرنے چاہئیں کہ سونے اور چاندی کی اتنی مقدار جو زکوٰۃ میں واجب ہوتی ہے وہ آج کی قیمت میں خریدی جاسکے اکثر اوقات اس میں غرباء کا نفع ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کی رائے پر عمل ہونا چاہئے، اور جس دن آدمی زکوٰۃ ادا کر رہا ہو اس دن کی قیمت کے لحاظ سے ادا کرنی چاہئے۔

شیرس کی خرید و فروخت

آج کل اسٹاک مارکٹ میں شیرس کی خرید و فروخت ہو رہی ہے، اس کے لئے

---

(۱) فیمن کانت لہ مائتا قفیز حنطۃ للتجارۃ قیمتھا مائتا درھم فحال علیھا الحول فلم یودِّ زکاتھا حتی تغیر سعرھا الی النقصان حتی صارت قیمتھا مائۃ درھم او الی الزیادۃ حتی صارت قیمتھا اربعمائۃ درھم ان علی قول ابی حنیفۃ ان ادی من عینھا یؤدی خمسۃ اقفزۃ فی الزیادۃ والنقصان جمیعاً لانہ تبین انہ الواجب من الاصل فان ادی القیمۃ یؤدی خمسۃ دراھم فی الزیادۃ والنقصان جمیعاً لانہ تبین انھا ھی الواجبۃ یوم الحول وعند ابی یوسفؒ ومحمدؒ ان ادی من عینھا یؤدی خمسۃ اقفزۃ فی الزیادۃ والنقصان جمیعاً وان ادی من القیمۃ یودی فی النقصان درھمین ونصفاً وفی الزیادۃ عشرۃ دراھم لان الواجب الاصلی عندھما ھو ربع عشر العین وانما لہ ولایۃ النقل الی القیمۃ یوم الاداء فیعتبر قیمتھا یوم الاداء.

(بدائع الصنائع ۲/۲۱-۲۲)

شرعی حکم کیا ہے؟

دیکھئے! اصل میں شیئرز اور حصص، جن کی قیمت گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے اور جس کو نفع اور نقصان کے اساس پر خرید کیا جاتا ہے وہ شرعاً جائز ہیں، اس میں لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ دس روپے میں ہم نے ایک حصہ خریدا اور ہمارے پاس کاغذ کی صورت میں ایک وثیقہ آگیا اور اس کو ایک ہزار میں دوسرے شخص کو فروخت کر دیا، تو گویا دس روپے کو ہم نے ایک ہزار کے بدلے فروخت کر دیا، اس لئے اس کو جائز نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اصل میں بات یوں نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ دس روپے جسے شیئر کہتے ہیں وہ اس جائیداد کا نام ہے جو اس کاروبار میں یا صنعت میں کسی نہ کسی مالی شکل میں موجود ہوتا ہے، ہم اس کے مالک ہو جاتے ہیں، اور جو کاروبار کا مینیجر ہوتا ہے، وہ ہمارے وکیل کی حیثیت سے اس سامان پر قبضہ کر لیتا ہے، اب اگر ہم اس چیز کو ایک ہزار روپے میں بیچتے ہیں تو ہم نے دس روپے ایک ہزار میں نہیں بیچے، بلکہ دس روپے میں ہم نے جو چیز خریدی تھی وہ ایک ہزار میں بیچی ہے۔ اس کو شریعت میں بیع مرابحہ کہتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا حق حاصل ہے کہ ہم کوئی چیز پانچ روپے میں خریدیں اور چاہیں تو اس کو پچاس روپے میں فروخت کر دیں، اس لئے اس کی اس ظاہری شکل کے اعتبار سے میں اس کو جائز سمجھتا ہوں، اگر اس کی مزید تفصیلات ہم سے بتائی جائیں اور اس میں کوئی شرعی نقص ہو تو میں اس بارے میں مزید کچھ روشنی ڈال سکتا ہوں۔

انشورنس کمپنی کی ایجنسی

زندگی کا بیمہ کروا سکتے ہیں یا نہیں اور لائف انشورنس کے کمیشن ایجنٹ بننے میں کیا قباحت ہے۔ اگر ان دو سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو اس کی وضاحت فرمائیں۔

اس پر تو ہمارے ملک کے تمام علماء کا اتفاق ہے کہ انشورنس کی موجودہ شکل اصلاً بالکل جائز نہیں[1] ہے، یہ عجیب لطیفہ ہے کہ انشورنس کو شروع تو کیا تھا مسلمانوں نے ہماری

---

(۱) ان اشتہاری و تجارتی بیموں میں کمپنیاں جو مالک کو خاص صورتوں میں معاوضہ دیتی ہیں (باقی حاشیہ صــــ پر)

فقہی کتابوں میں اس کا نام "سوکرہ" ملتا ہے۔ علامہ شامیؒ نے اس پر بحث بھی کی ہے اور یہ سلسلہ یوں شروع ہوا تھا کہ اس زمانہ میں جو عرب تجار تھے، وہ عام طور پر سمندر کے ذریعہ تجارت کیا کرتے تھے، ہر سال کچھ سمندری جہاز تباہ ہو جایا کرتے تھے، اس خطرے سے حفاظت کے لئے انہوں نے باہمی تعاون کی ایک خاص صورت مقرر کی تھی، لیکن یہ "سوکرہ" جب مغربی اقوام اور یہود تک پہونچا تو انہوں نے اپنی فطرت اور طبیعت کے مطابق اس میں سود و قمار کو بھی داخل کر دیا، اس لئے بحالتِ موجودہ یہ سود و قمار سے مرکب ہے اور بہر حال ناجائز ہے، اور جب یہ ناجائز ہے تو جو لوگ اس کے کمیشن ایجنٹ ہوں ان کا ذریعۂ ملازمت اور ذریعۂ معاش بھی ناجائز ہے کہ جو گناہ ہے اس میں تعاون بھی گناہ ہے، وہ بھی سود جیسا گناہ ہے، جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور اس کے گواہ بننے والے پر، تو جس میں ایسے واسطوں اور ایسے ذریعوں کو بھی ممنوع قرار دیا گیا ہو، تو ظاہر ہے کہ ایسے معاملے میں کمیشن ایجنٹ بننا کیونکر جائز ہو گا؟ مسلمانوں کو ضرور اس لعنت سے بچانا چاہئے۔

قصۂ حسینؓ و یزید

حسینؓ اور یزید میں کون برحق تھا، اور یزید کا دین میں کیا مقام ہے؟

اس وقت بعض تحریروں کی وجہ سے یہ مسئلہ ایک آتشیں مسئلہ بن گیا ہے، لیکن جو حقیقت ہے مجھے اس کے بیان کرنے میں کوئی جھجک نہیں۔ جہاں تک یزید کی بات ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: صورتاً تو وہ عوض ہے، اس مال تلف شدہ کا، مگر واقعی میں عوض ہے اس رقم کا جو ماہانہ یا سالانہ داخل کی جاتی ہے، کیونکہ ان کو مقصود وہی ہے، پس باعتبار صورت کے تو یہ قمار ہے۔ لانہ تعلیق الملك علی الخطر والمال فی الجانبین۔ اور باعتبار حقیقت کے سود ہے: لعدم اشتراط المساواۃ فی الجانبین فیما یجب فیہ المساواۃ اور قمار اور سود دونوں حرام ہے۔ پس یہ معاملہ یقیناً حرام ہے۔

اسی طرح زندگی کا بیمہ، وہ صورتاً رشوت ہے۔ لان المال فیہ عوض من غیر متقدم وھو النفس اور حقیقتاً سود ہے: لعین ما مر فی المال۔

(امداد الفتاویٰ، ۵/۱۶۱)

اس میں لوگ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، کچھ لوگ وہ ہیں جو یزید کو فاسق و فاجر کہتے ہیں اور گو اہل سنت والجماعت میں علماء نے یزید کو کافر تک کہا ہے، مستحق لعنت تو ٹھہرایا ہی ہے، لیکن بہر حال یہ بھی کچھ بہتر نہیں۔ اور کچھ لوگ وہ ہیں جو یزید کو برحق قرار دینا چاہتے ہیں اور ان کے مقابلے میں سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کو بغاوت قرار دینا چاہتے ہیں، یہ ان سے زیادہ بدترین لوگ ہیں، دراصل یہ "ناصبیت" ہے اور جو لوگ یزید کے اقدام کو اور اس کی ولی عہدی کو صحیح قرار دینا چاہتے ہیں، ان کا منشاء ممکن ہے کہ صحابی رسول سیدنا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے اقدام کو صحیح ثابت کرنا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی معقولیت نہیں کہ حضرت معاویہؓ کے اقدام کو صحیح ثابت کرنے کے لئے دوسرے صحابی رسول یہاں تک کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو، کہ جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لحم و استخواں اور گوشت و پوست کی نسبت حاصل ہے اور جو فتح مکہ کے پہلے کے مسلمان ہیں اور فتح مکہ کے پہلے کے مسلمانوں کا درجہ فتح مکہ کے بعد کے اسلام لانے والوں سے بڑھ کر ہے، غلطی پر ثابت کیا جائے۔ یہ کوئی دانش مندی کی بات نہیں ہے۔ جہاں تک یزید کی بات ہے، تمام اہل سنت کا اس پر قریب قریب اتفاق ہے کہ یزید کو حضرت معاویہ کا ولی عہد بنانا حضرت امیر معاویہؓ کی اجتہادی غلطی تھی، وہ اس کو قوم اور امت کے لئے مفید سمجھتے تھے اس لئے وہ اس اجتہادی خطا پر انشاء اللہ عند اللہ مغفور ہیں، البتہ خود یزید کے بارے میں تمام اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اقدام صحیح تھا اور یزید کا اقدام ان کے مقابلہ میں غلط تھا، اسی لئے سلف صالحین نے عموماً یزید کے اقدام کی مذمت ہی کی ہے۔ مولانا ثناء اللہؒ پانی پتیؒ نے تو یزید پر لعنت بھی جائز قرار دی ہے، امام احمدؒ سے پوچھا گیا کہ یزید پر لعنت جائز ہے؟ تو فرمایا کہ یزید پر لعنت کیوں جائز نہ ہوگی، جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر لعنت کی ہے، لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کیسے لعنت کی ہے، قرآن مجید میں تو اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، انہوں نے ایک آیت پڑھی:

"فهل عسيتم ان توليتم ان تفسدوا في الارض وتقطعوا ارحامكم الخ" (جو لوگ کہ زمین میں فساد پیدا کرتے ہیں، قطع رحمی کرتے ہیں ان پر اللہ کی لعنت ہو) اور علامہ تفتازانی نے یزید کے

بارے میں صاف طور سے لکھا ہے: "لعنۃ اللہ علیہ وعلی اعوانہ وعلی اصحابہ"۔ (اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس پر اور اس کے معاونین پر اور اس کے اصحاب پر) یہاں تک کہ علامہ آلوسی کا بیان ہے کہ: "یغلب علی ظنی ان الخبیث لم یکن مصدقاً برسالۃ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"۔ (میرا تو خیال ہے کہ اس خبیث کا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر یقین ہی نہیں تھا)

ایک ایسے شخص کی حمایت اور اس کی طرف سے مدافعت نہایت درجہ بدبختی اور کم نصیبی کی علامت ہے۔

آج کل بعض لوگ یہ تحریک لے کر اٹھے ہیں کہ یزید برحق تھا اور سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس مسئلہ میں خاطی تھے، مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے وہ صحابہ کے درجہ اور عظمت میں کون سا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ خلفاء راشدین کے بعد اہل بیت سے بڑھ کر کون افضل ہے؟ ان کے مقام و مرتبہ کو کم کرنا خود صحابہؓ کی شان و مقام کے ساتھ بھی زیادتی ہے۔ صحیح یہی ہے کہ یزید خاطی تھا اور اس نے اہلِ بیت کے ساتھ بے حرمتی کا معاملہ کیا، خود کعبۃ اللہ کے ساتھ جو بے حرمتی کا معاملہ روا رکھا گیا، یہ اس کے خاطی ہونے کے لئے کافی ہے، واقعۂ حرہ اس کے علاوہ ہے۔ تاہم زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کے بارے میں سکوت اور خاموشی اختیار کی جائے کہ: "تلك امۃ قد خلت لها ما كسبت وعليها ما اكتسبت"، رہ گئی صحابۂ کرامؓ کی بات تو سیدنا حضرت علیؓ ہوں یا حضرت امیر معاویہؓ، سیدنا حضرت حسینؓ ہوں، یا حضرت مغیرہؓ بن شعبہ سبھی مسلمانوں کے سر آنکھوں پر ہیں، ان سب سے محبت اور ان کی عظمت جزو ایمان ہے۔ ان تمام صحابہؓ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کے متعلق زبان کھولنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو: "اللہ اللہ فی اصحابی من احبھم فبحبی احبھم ومن ابغضھم فببغضی ابغضھم"۔ (جس نے ان سے محبت کی، اس نے میری خاطر ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو دراصل اس کو مجھ سے بغض ہے)

صدقۃ الفطر کب ادا کیا جائے؟

کیا فطرہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ فطرہ عید کی نماز سے پہلے ہی ادا کیا جائے؟

اگر بعد میں دے تو گناہ ہوگا؟

پہلے نہ دے سکا ہو اور نماز کے بعد، یا کچھ دنوں کے بعد ادا کردے تب بھی صدقۃ الفطر ادا ہو جائے گا، ایسا نہیں کہ اس کی وجہ سے اس پر کوئی گناہ ہو، البتہ تاخیر کی وجہ سے ثواب میں کمی ضرور ہوگی۔

صدقۃ الفطر عید سے پہلے نکالے اور بعد میں ادا کیا جائے

زید نے اپنا فطرہ عید سے قبل ہی بکر کے حوالے کر دیا کہ وہ مستحق کو پہنچا دے اور بکر نے وعدہ کر کے لے لیا، لیکن بعد میں بعض لوگوں سے معلوم ہوا کہ بکر نے عید سے قبل مستحق کو فطرہ نہیں پہونچایا، تو زید کو فطرہ کا ثواب یا افضلیت کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ اور بکر کی اس کوتاہی پر گناہ ہوگا یا نہیں؟

اگر بکر نے عید سے پہلے ہی دیدیا، تب تو زید کے منشاء کی تکمیل ہو ہی گئی، اور اگر بکر نے کسی بڑی دینی مصلحت کی وجہ سے فطرہ کی ادائیگی کو مؤخر کر دیا تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، اصل منشاء اجر میں زیادتی ہے، بعض صورتوں میں تاخیر ہی میں اجر بڑھ جاتا ہے، تو اس طرح وہ صدقہ دینے والے کے منشاء کی تکمیل ہی کر رہا ہے، نہ کہ اس کی مخالفت، اسلامی ملک کا بیت المال ہو تو اس میں فطرہ بھی جمع کئے جا سکتے ہیں، ایسی صورت میں یہ تو ممکن نہ ہوگا کہ عید کی رات ہی بیت المال کا تمام فطرہ تقسیم کر دیا جائے، کچھ تقسیم ہوگا اور کچھ باقی رکھا جائے گا، دین کے بڑے بڑے مقاصد اور دوسری ضروریات کے لئے اس کو خرچ کیا جائے گا، تو اگر ایسے مقاصد کے لئے بکر نے فطرہ کی رقم کو روک رکھا تھا اور بعد میں دیا، اور کسی زیادہ صحیح مصرف میں استعمال کیا تو ممکن ہے کہ اس کے اس عمل کی وجہ سے ثواب اور اجر میں اضافہ ہو جائے۔

دینی مدارس کو صدقۂ فطر

بعض لوگ دینی مدارس کو فطرہ دیتے ہیں، ان میں عید سے قبل فطرہ دینے کا ثواب ملے گا یا نہیں؟

جب کہ ضروری نہیں کہ عید سے پہلے ہی سب کا فطرہ تقسیم ہو اور مدرسہ کے ذمہ دار حضرات کو بروقت فطرہ تقسیم نہ کرنے پر عنداللہ جواب دہی ہوگی یا نہیں؟ کیونکہ عید کے موقع پر عام طلبہ چھٹی پر ہوتے ہیں

مسئلہ یہ ہے کہ کسی چیز کا وکیل کا لینا دراصل موکل کا حاصل کرلینا ہے، آپ نے کسی کو مامور کیا کہ فلاں شخص سے جاکر رقم حاصل کرلو، تو اگر اس نے پیسہ حاصل کرلیا تو شریعت کی نگاہ میں گویا آپ نے پیسہ حاصل کرلیا۔ پس مدرسوں میں جو طلبہ داخل ہوتے ہیں وہ دراصل مدرسہ کے مہتمم اور ذمہ دار کو اپنا وکیل بناتے ہیں، طلبہ کی طرف سے وہ اعانت وصول کرتے ہیں، لہٰذا جب ادارہ کا ذمہ دار اس مد کی رقم وصول کرلے، تو سمجھا جائے گا کہ گویا یہ رقم ان طلبہ تک پہنچ گئی، اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، اور ایک بات اور بھی عرض کرتا ہوں کہ قرآن مجید نے بنیادی طور پر صدقات کے دو مقصد متعین کئے ہیں، فقراء کی ضرورت کو پورا کرنا: "انما الصدقات للفقراء والمساکین" دوسرے اسلام کی حفاظت وصیانت اور اعلاء کلمۃ اللہ۔ اسی لئے قرآن مجید نے صدقات کا مصرف "مؤلفۃ القلوب" اور "فی سبیل اللہ" کو بھی قرار دیا ہے، ان دونوں مصارف کا مقصود یہی ہے کہ ایسا کام کیا جائے جس سے "اعلاء کلمۃ اللہ" ہو، اس وقت جو دینی مدارس اور دینی مدارس ہی پر موقوف نہیں، دینی کام کرنے والے جو لوگ ہیں اگر ان پر زکوٰۃ وصدقات کی رقم کو خرچ کریں تو شریعت کے دونوں مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے"[1]۔ ایک محتاج کی ضرورت کی بھی تکمیل ہوتی ہے اور دین کی حفاظت وصیانت میں بھی آپ حصہ دار ہوتے ہیں، اور اگر آپ محض کسی غریب شخص کو دیدیں جو دین کی حفاظت واشاعت میں مشغول نہیں ہے تو آپ نے صدقہ کا ایک مقصد پورا کیا، دوسرا مقصد پورا نہ ہوسکا، اس لئے ظاہر ہے کہ اس کا ثواب نسبۃً کم ہوگا

شوہر غائب کی بیوی کیا کرے؟

زید کی حال ہی میں شادی ہوئی، تھوڑے دنوں بعد اس کے تعلقات خراب ہوگئے، زید بیوی کو

---

(۱) التفسیر بطالب العلم وجیہ، ردالمحتار، ۲/ ۶۱-۱۸۳

چھوڑ کر چلا گیا ہے، بیوی کو ستاتا ہے اور طلاق بھی نہیں دینا چاہتا ہے، اس کا پتہ معلوم نہیں، گھر تو آتا ہی نہیں، کبھی کبھی فون پر بات کرتا ہے۔ تو اگر اس کا پتہ معلوم نہ ہو تو ایسے شخص کا کیا کیا جانا چاہئے؟ کتنے سال بیوی کو انتظار کرنا چاہئے، کیا، ایک سال کے بعد دوسری شادی کر سکتی ہے؟

شریعت میں اصول یہ ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات جو نکاح کے ذریعہ قائم ہوتے ہیں، اس کے ختم ہونے کی تین صورتیں ہیں، ایک صورت ہے فسخ کی، یعنی کوئی ایسی صورت پیش آجائے، جس سے نکاح آپ سے آپ ختم ہو جائے، ایسی بعض شکلیں ہوتی ہیں، جیسے عورت خدانخواستہ مرتد ہو گئی تو نکاح آپ سے آپ ٹوٹ جائے گا۔ دوسری شکل طلاق کی ہے، شوہر طلاق دیکر علیمدہ کر دے، طلاق ہی کی ایک شکل خلع ہے، اگر عورت کچھ دے کر طلاق لینا چاہتی ہے تو یہ "خلع" ہے، اور تیسری صورت تفریق کی ہے کہ اگر واقعی شوہر بیوی کے حقوق ادا نہیں کرتا ہے اور کسی مسئلہ میں حق تلفی کر رہا ہے تو بیوی کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ قاضی شریعت کے پاس اپنا مقدمہ لے جائے اور ان سے شکایت کرے کہ شوہر میرا حق ادا نہیں کر رہا ہے اگر قاضی شواہد و ثبوت کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ واقعی عورت اپنے اس دعوے میں صادق ہے، تو وہ تحقیق کے بعد دونوں میں تفریق کر دے گا، اس کے بعد اس کے لئے دوسرا نکاح کرنا جائز ہو گا۔[1] تو جو شکل بتلائی گئی ہے، اس میں وہ تفریق کا دعویٰ کر سکتی ہے، اور اس میں تفصیل یہ ہے کہ جو شخص غائب ہو اگر وہ ایسا "شریف" آدمی ہو کہ تین چار سال کا نان و نفقہ بیوی کے لئے چھوڑ گیا ہو تب تو قاضی کے پاس مقدمہ جانے کے بعد چار سال تک اس کا انتظار کیا جائے گا، اس کے بعد دونوں میں تفریق کر دی جائے گی، لیکن اگر وہ اتنے دنوں تک کا نفقہ چھوڑ کر نہ گیا ہو، یا نفقہ چھوڑ کر گیا ہو، لیکن عورت کہتی ہے کہ میں اتنے دنوں تک اپنی عفت و عصمت کی حفاظت نہیں کر سکتی، تو قاضی جب اس مسئلہ پر پوری طرح تحقیق کر کے مطمئن ہو جائے گا کہ واقعی شوہر اس معاملہ میں زیادتی سے کام لے رہا ہے تو اس کو

---

(۱) لکن ان ترك لها الغائب ما يقوم بها فهو كالحاضر اذا لم يفتها الوطأ وهو قوله لا لها والا فقها الحالم عند مطالبتها. لقوله تعالىٰ ولا تمسكوهن ضرارًا لتعتدوا. والحديث لا ضرر ولا ضرار في الاسلام والحاكم وضع لدفع المضارة الايلاء والظهار وهذا ابلغ والفسخ مشروع بالعيب ونحوه. (سبل السلام، ۳/۲۰۷)

امام احمد کے یہاں وہ شخص جو بالکل لاپتہ ہو، تاہم مستقر سے غائب ہو اور بیوی کا نفقہ ادا نہ کیا ہو، تو نفقہ ادا نہ کرنے کی وجہ سے اس کا نکاح فسخ کرنے کی اجازت ہے۔ (الاقناع ۴/۱۴۳) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جدید فقہی مسائل۔

اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ میاں بیوی کے درمیان تفریق کردے، اس کے لئے کسی خاص مدت کا انتظار ضروری نہ ہوگا، لیکن ایک بہت پیچیدہ صورت ہمارے ملک میں یہ ہے کہ ہمارے یہاں کی جو عدالتیں ہیں وہاں مسلمانوں کے مقدمات کے لئے الگ بنچ نہیں ہیں کہ جہاں مسلمان جج فیصلہ کرتے ہوں، بلکہ غیر مسلم فیصلہ کرتے ہیں اور غیر مسلم جج کا کوئی فیصلہ مسلمان کے حق میں شرعاً معتبر نہیں ہے، کیونکہ اصل میں قاضی کو تمام مسلمانوں پر ولایت حاصل ہوتی ہے، پس وہ مرد کے ولی کی حیثیت سے عورت پر طلاق واقع کرتا ہے اور کسی کافر کو کسی مسلمان پر ولایت حاصل نہیں ہوسکتی، اسلئے کہ اگر کافر جج قانون کی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے کسی مرد کی طرف سے کسی عورت کو طلاق دیدے اور طلاق کا فیصلہ کردے، پھر بھی وہ عورت اس کی زوجیت سے نہیں نکل سکتی ہے، اسی لئے ہندوستان جیسے ملک میں علمار کا خیال ہے کہ مسلمانوں پر یہ بات واجب ہے کہ وہ اپنے طور پر نظامِ قضا رقائم کریں، اتفاقِ رائے سے ایک شخص کو قاضی مقرر کریں اور وہ لوگوں کے مقدمات کی تحقیق کرکے جو فیصلہ کرے وہ فیصلہ مسلمانوں پر واجب العمل ہوگا۔

مرتبہ: مولانا عبدالمجید قاسمی (انچارج کتب خانہ)

خبر نامہ
دارالعلوم سبیل السلام، حیدرآباد

• اس سال بھی قدیم معمول کے مطابق ۱۱ر شوال ۱۴۱۲ھ کو جامعہ ہذا میں داخلہ کا آغاز ہوا، شعبۂ عربی میں ۱۷۰، شعبۂ حفظ میں تقریباً ۱۵۰، شعبۂ روضۃ الاطفال میں ۱۷۵ اور تخصص فی الفقہ میں ۱۳ طلبہ کے داخلے منظور کئے گئے۔

• ۲۵ر شوال روز چہارشنبہ کو باضابطہ تعلیم کا آغاز ہوا اور حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے زیر صدارت افتتاحی اجلاس ہوا، جس میں مختلف اساتذہ نے خطاب کیا اور طلباء کو مفید نصیحتیں کیں۔

• اس سال جامعہ ہذا میں تجوید و قرأۃ کا خصوصی انتظام کیا گیا ہے، ہر جماعت میں تجوید کی کتابیں داخلِ نصاب کی گئی ہیں اور بین الاقوامی ایوارڈ یافتہ قاری جناب قاری محمد علی خاں صاحب سے ہفتہ میں ایک دن کا وقت لیا گیا ہے، تاکہ طلبہ ان سے اذان و قرأت کی مشق کر سکیں۔ بحمد اللہ محترم قاری صاحب کی توجہات سے بڑا مفید اثر پڑ رہا ہے اور طلبہ استفادہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو مزید استحکام عطا فرمائے۔

• ۵ر ذیقعدہ روز ہفتہ کو بخاری شریف کے افتتاح کے سلسلہ میں ایک خصوصی تقریب منعقد ہوئی، اس سال اس تقریب کے لئے معروف عالم دین جناب مولانا محمد حنیف ملی صاحب شیخ الحدیث معہد ملت مالیگاؤں کو دعوت دی گئی، موصوف نے بخاری شریف کی پہلی حدیث کا تفصیلی درس دیا اور خطاب فرمایا، جامعہ ہذا کے مختلف اساتذہ۔ جناب صدر مدرس صاحب مولانا فضل الرحمٰن قاسمی اور مولانا محمد برکت اللہ قاسمی نے بھی خطاب کیا۔ اساتذہ و طلباء کے علاوہ شہر کے علماء اور معززین بھی شریک ہوئے۔

• ۷ر ذیقعدہ کو مولانا ملّی صاحب نے تخصص فی الفقہ کے طلبہ سے خصوصی خطاب فرمایا، اور ان کے سوالات کے جوابات دئے۔

• افتتاحِ بخاری شریف کی اس تقریب میں امتحانِ سالانہ ۱۴۱۲ھ میں ممتاز نمبرات سے کامیاب ہونے والے طلبہ کو انعامات بھی دئے گئے، ان خوش قسمت طلبہ کے نام اس طرح ہیں:

شعبۂ عربی:

اوّل :	محمد انظر	دورۂ حدیث
دوم :	شہاب الدین	ہفتم عربی
سوم :	عبدالحفیظ قادری	دورۂ حدیث

شعبۂ حفظ:

اوّل :	عبدالعزیز یحیٰی و محمد ابراہیم	حفظ (ج)
دوم :	عبدالرحیم	حفظ (ج)
سوم :	عبدالرحمٰن	حفظ (ج)

روضۃ الاطفال:

اوّل :	محمد اصغر	اوّل اردو (ب)
دوم :	ظفر الاسلام	اوّل اردو (الف)
سوم :	محمد عبدالغنی	دوم اردو

• ۱۰ر ذوقعدہ کو انجمن الفلاح، طلبۂ دار العلوم سبیل السلام کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا اور طلبہ کے مشورہ سے حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے عربی، اردو تقریر و تحریر اور دیواری پرچہ کے لئے حسب ذیل طلبہ کو ذمہ دار نامزد کیا۔

اردو تقریر	تنویر اکرم (ہفتم عربی)	عتیق الرحمٰن (ششم عربی)
عربی تقریر	عبداللہ (ششم عربی)	صلاح الدین 〃 〃
اردو تحریر	شہاب الدین (دورۂ حدیث)، نوشاد علی (ششم عربی)	لطیف الدین 〃 〃
دیواری پرچہ	اسرار الحق (ہفتم عربی)	ریاض احمد (چہارم عربی)

کتب خانہ　　　محمد اعجاز (ششم عربی)　　　طارق النور (چہارم عربی)

• انجمن الفلاح کے تحت پابندی سے ماہانہ تقریری و تحریری مقابلہ منعقد ہوتے رہے، اور طلبہ کا ہفتہ وار تقریری پروگرام منعقد ہوتا رہا۔

• طلبہ میں دعوتی اور تبلیغی سرگرمیوں کے لئے اس سال شروع ہی سال سے ہر ہفتہ ۲۴ گھنٹہ کے لئے جماعت نکلنے کا نظم رہا، جناب صدر صاحب نے مولانا کمال الدین صاحب قاسمی کو اس کا ذمہ دار بنایا اور حافظ ابراہیم خلیل متعلم ششم عربی کو طلبہ کا امیر مقرر کیا، بارکس کے گرد و نواح کے علاوہ شہر کے دور دراز علاقوں میں، بلکہ بعض دفعہ شہر سے باہر جاکر طلبہ کی جماعتوں نے دعوت کا کام سرانجام دیا۔

• طلباء کا دیواری پرچہ معمار بھی ہر ماہ پابندی سے نکلتا رہا، اور منتہی اور ابتدائی جماعتوں کے طلبہ نے بھی پوری دلچسپی کے ساتھ اس میں حصہ لیا۔

• حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی ناظم جامعہ ہذا امریکہ کی بعض مسلم تنظیموں کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے اور تقریباً رمضان تا محرم وہیں قیام رہا اور آپ نے وہاں مختلف علمی اور دعوتی پروگراموں سے خطاب فرمایا، امریکی معاشرت کے مختلف گوشوں پر آپ نے بڑے دلچسپ اور معلومات افزا مقالات بھی لکھے، جو روزنامہ سیاست حیدرآباد اور ملک کے مختلف مؤقر اخبارات میں شائع ہوئے۔ امریکہ سے واپس ہوتے ہوئے آپ نے برطانیہ میں بھی مختصر قیام کیا اور پیرس بھی تشریف لے گئے، جہاں معروف محقق ڈاکٹر حمید اللہ سے تبادلۂ خیال اور گفتگو کا موقع ملا، کویت اور دوبئی میں چند دنوں توقف کرتے ہوئے آپ کی واپسی ہوئی

• مولانا محمد برکت اللہ صاحب قاسمی جمعیۃ علماء ہند کی دعوت پر ۵ ر ذیقعدہ کو دہلی تشریف لے گئے اور جمعیۃ کی مجلس منتظمہ کے اجلاس میں شرکت فرمائی۔

۲۲ ر ذوقعدہ کو مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی کی دعوت پر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی جناب مولانا مفتی عبدالودود صاحب اور مولانا احمد عبدالمجیب صاحب نے دارالعلوم سبیل الہدیٰ شادنگر کا معائنہ فرمایا۔ واضح ہو کہ مدرسہ ہذا کے ناظم مولانا محمد طاہر قاسمی اور صدر مدرس مولانا محمد فیاض سبیلی جامعہ ہذا کے ابنائے قدیم میں ہیں۔

• یکم ذی الحجہ کو دار العلوم انوار الہدیٰ میں جلسۂ قرأت کا مقابلہ ہوا، جناب صدر مدرس صاحب اس جلسہ کے مہمان خصوصی تھے، آپ کے علاوہ جناب عبد الرحیم قریشی، سکریٹری مسلم پرسنل لا بورڈ، جناب ابراہیم بن عبد اللہ مسقطی (ایم ایل اے) اور جناب ولی قادری (امیر جامعہ نظامیہ) بھی اس تقریب میں مدعو تھے، مولانا رحمانی نے اجلاس کے اختتام پر قرآن مجید کی عظمت اور دوسری مذہبی کتابوں کے مقابلہ اس کے امتیازات پر روشنی ڈالی۔

• ۵ ذوالحجہ کو مسجد بازار گارڈ میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ کے زیر صدارت گرمائی دینی اسکول کی اختتامی تقریب منعقد ہوئی، جس میں طلبہ نے اپنے پروگرام پیش کئے، مسجد ہٰذا کے امام اور اس اسکول کے منتظم مولوی قاری ارشاد سبیلی صاحب ہیں جو جامعہ ہٰذا کے فرزندان میں ہیں۔

• بقرعید کے موقع سے اساتذہ اور طلبہ اور مدرسہ کے ہمدردان و معاونین نے خوب جم کر محنت کی اور وصولی چرم قربانی کا کام کیا، حضرت ناظم صاحب اور الحاج سید ضیاء الرحمٰن صاحب (صدر مجلس انتظامی) گو کہ ان دنوں بیرونِ ملک کے سفر پر تھے، لیکن برابر ٹیلی فون کے ذریعہ ہدایات اور مشورے دیتے رہے، اور جناب صدر مدرس صاحب کی سرکردگی میں تمام اساتذہ نے مل کر پوری یکسوئی اور توجہ کے ساتھ اپنے کام میں مشغول رہے۔

• بحمد اللہ اس سال بھی الحاج سید ضیاء الرحمٰن صاحب (صدر مجلس انتظامی) حج مبرور کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے اور باوجود ناسازگی طبع کے اپنے صاحبزادہ ڈاکٹر ریاض الرحمٰن صاحب کے ساتھ مل کر حج فرمایا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صحت و عافیت کے ساتھ رکھے۔

• جامعہ ہٰذا کے قدیم خادم اور مبلغ جناب حافظ عبد الرشید صاحب نے رمضان اور شوال میں کرناٹک اور تمل ناڈو کے علاقوں کے دورے کئے اور اس سال دوبارہ حج کرنے کا شرف حاصل کیا۔ (بارک اللہ فی عمرہ واعمالہ)

• مفتی مظہر الدین صاحب مرحوم جامعہ ہٰذا کے قیام کے ابتدائی زمانہ میں عرصہ تک یہاں تدریس و افتاء کی خدمت انجام دیتے رہے، جامعہ ہٰذا جب شہر سے قدرے دور موجودہ مقام پر منتقل ہوا تو دوری کی وجہ سے سبکدوش ہو گئے، لیکن اپنی مرنجاں مرنج طبیعت کی وجہ سے جامعہ کے

کے منتظمین واساتذہ سے ہمیشہ قریبی روابط رہے، ادھر عرصہ سے علیل وفریش تھے، ۱۰رشوال ۱۴۱۲ھ منگل کے دن مرحوم کا انتقال ہوگیا، جنازہ اور تدفین میں جناب مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی جناب مفتی عبدالودود صاحب مظاہری اور مختلف اساتذہ وطلبار نے شرکت کی، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے، اور بال بال مغفرت فرمائے۔

- فرزندانِ جامعہ میں مولانا عبدالرحمٰن سبیلی نے اردو زبان میں جامع اور مفید خطبات مرتب کئے ہیں اور قاضی مظہرالدین سبیلی نے علم اور علمار کی فضیلت پر ایک کتاب مرتب کی ہے، مستقبل قریب میں ان کی اشاعت متوقع ہے۔

وارد ین و صادرین کے نظر میں

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد
ایک فکر انگیز ادارہ

وہ بڑی مسعود ساعت تھی، جب مجھے دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد میں حاضری اور معائنہ کا موقع ملا۔ اسلام کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں میں دینی روح پھونکنے، نوخیزوں اور نوجوانوں جو دراصل مستقبل میں قوم کی امیدوں کا مرکز اور امت کے قائد و امام ہیں، میں جذبۂ اسلامی بیدار کرنے میں ادارہ کے ذمہ داران ہر آن متحرک، ہر دم جواں اور ہر لمحہ رواں نظر آتے ہیں، باطل تحریکات اور دین بیزار نظریات مثلاً ہندوازم، قادیانیت، مسیحیت وغیرہ کا پوری قوت کے ساتھ اور دل کے درد کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں، اسلام کے دامن پر آنے والی چنگاریوں کو بجھانے میں ان کی تحریر و خطابت کا بڑا مؤثر کردار ہے، ان کی زبان و قلم میں دل کا سوز اور قلب صادق کی ایمانی حرارت اور ان کا خلوص جھلکتا ہے، موجودہ نازک اور انتہائی تباہ کن حالات میں علم و ثقافت اور دین و شریعت کے میدان میں ان کی یہ مخلصانہ مساعی اور گراں قدر خدمات انتہائی قابل قدر اور لائق تحسین ہیں، اللہ تعالیٰ ان "مردانِ کار" کی مثال عام و تام فرمائے، ان کی جد و جہد کو قبولیت سے نوازے، اور امت کو ایسے مخلص شہسوار اور جانباز عطا کرے، جو اسلام اور دین کی سرحدوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیں۔

دارالعلوم سبیل السلام محض ایک دینی درس گاہ اور علم و تعلیم کی چہار دیواری نہیں، بلکہ یہ دریچ علومِ اسلامی کے پیاسے انسانوں کی تربیت گاہ اور فکر ساز ادارہ ہے۔ یہاں علومِ اسلامی کے ساتھ ساتھ فقہ اسلامی کا ایسا بے مثال شعبہ قائم ہے، جہاں سے طلبۂ فقہ و شریعت میں بصیرت، تعمق اور جذبۂ تحقیق، اور پوری لیاقت و صلاحیت کے ساتھ واپس لوٹتے ہیں۔

ان کوششوں کے پیچھے ادارہ کے ذمہ داران حضرات ———— اور

ممتاز عالمِ دین حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی حفظہ اللہ (ناظم جامعہ) اور ممتاز فقیہ محترم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی قدآور شخصیتیں ہیں۔ حاملین علومِ نبوت کے لئے ان حضرات نے کس قدر خوشگوار مواقع فراہم کئے کہ وہ اپنے نصابِ تعلیم کی تکمیل کر کے امت کے وقضایا اور عہد جدید میں پیش آنے والے نئے فقہی مسائل کا حل تلاش کرنے کی استعداد پیدا کریں اور صحیح معنوں میں امت کے قائد و امام بنیں۔

کتاب و سنت اور فقہی مراجع سے مسائل کے اخذ و استنباط میں نے طلبار کے اندر اعلیٰ لیاقت اور فقہی بصیرت پائی ہے۔ ظاہر ہے اس کا سہرا جامعہ کے ان ذمہ داران کے سر جاتا ہے، جنہوں نے درسیات اور مقررہ نصابِ تعلیم کے ساتھ خارجی مطالعہ اور جدید مسائل سے واقفیت کے لئے ایسا نظامِ تعلیم اور ماحول تیار کیا جس کی اسلامی و دینی درس گاہوں میں نظیر نہیں ملتی، فقہ کے شعبہ میں پڑھنے والے طلبہ نے مختلف موضوعات پر نہایت وقیع اور قیمتی مقالات لکھے ہیں جو دلائل اور قوت استدلال کے اعتبار سے اطمینان بخش ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جدید مسائل کی تدوین و ترتیب کی سمت میں ادارہ کی یہ کوششیں بلاشبہ انقلابی اور اقدامی ثابت ہوں گی۔ خدا جزائے خیر دے ادارہ کے تمام ذمہ داران کو، جو قافلۂ علم شریعت کی تربیت و تعلیم میں انتھک کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ دعا کرتا ہوں کہ یہاں اختصاص کے مختلف شعبوں میں تعلیم و تربیت کی بابرکت مساعی جاری رہیں اور اسے روز افزوں فروغ و ترقی حاصل ہو، اور توفیق ایزدی ہمیشہ اس کی رفیق رہے۔

والسلام علیکم

حضرت مولانا محمد حنیف ملی
شیخ الحدیث معہد ملت مالیگاؤں
۱۰ر مئی ۱۹۹۲ء

ترجمہ از عربی
مولانا احمد عبد المجیب قاسمی ندوی
استاذ دار العلوم سبیل السلام، حیدرآباد

SAFA

صفا

DARUL-ULOOM
SABEEL USSALAM
Sabeel Nagar, Balapur, Behind
Sallah, Barkas, Hyderabad-500 005. A.P. (India)

Phone: 239450